

بلاک

4

اردو کے نمائندہ مثنوی نگار اور متن کی تدریس و تفہیم

	بلاک 4 کا تعارف
	اکائی 13
205	ملا وجہی: حیات، ادبی کارنامے اور 'قطب مشتری' کا جائزہ
	اکائی 14
221	نصرتی: حیات، ادبی کارنامے اور 'علی نامہ' کا جائزہ
	اکائی 15
235	ابن نشاٹی: حیات، ادبی کارنامے اور 'پھول بن' کا جائزہ
	اکائی 16
	میر حسن: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (سحر البیان: داستان وارد ہونے بے نظیر کے بدر منیر کے باغ میں اور شاہ زادی کے عاشق ہونے میں)
251	
	اکائی 17
	پنڈت دیانکرنسیم: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (گلزار نسیم: آوارہ ہونا بکاولی کا تاج الملوک گل چیں کی تلاش میں)
269	
	اکائی 18
	مرزا شوق لکھنوی: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس و تفہیم (زہر عشق: معشوق کی رخصتی)
285	

بلاک 4 تعارف

بلاک 4



ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 13 ملاوجہی: حیات، ادبی کارنامے اور 'قطب مشتری' کا جائزہ

ساخت

13.3 اغراض و مقاصد

13.2 تمہید

13.3 ملاوجہی: حیات، ادبی کارنامے اور قطب مشتری کا جائزہ

13.3.1 ملاوجہی کے سوانحی احوال و کوائف

13.3.2 ملاوجہی کے ادبی کارنامے

13.3.3 ملاوجہی کی مثنوی قطب مشتری کا جائزہ

13.3.4 ماہصل

13.4 آپ نے کیا سیکھا؟

13.5 اپنا امتحان خود لیجیے

13.6 سوالوں کے جوابات

13.7 فرہنگ

13.8 کتب برائے مطالعہ

13.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- ملاوجہی کے سوانحی احوال و کوائف سے واقف ہوں گے
- ملاوجہی کے ادبی کارناموں کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے
- ملاوجہی کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے آگاہ ہوں گے
- ملاوجہی کی مشہور مثنوی 'قطب مشتری' سے بحث کریں گے
- ملاوجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' کے تجزیے کے ذریعے اس کی انفرادیت کو سمجھیں گے

13.2 تمہید

عزیز طلبا! گذشتہ اکائیوں میں آپ مثنوی کی تعریف، اجزائے ترکیبی اور فنی خصوصیات سے واقف ہوئے۔

آپ نے مثنوی کی اقسام، دکن اور شمالی ہند میں اردو مثنوی کے ارتقاء، نمائندہ مثنوی نگار اور نمائندہ مثنویوں سے واقفیت حاصل کی اور دکن اور شمالی ہند کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات کو بھی سمجھا۔ اب اس اکائی میں آپ اُردو کے ممتاز مثنوی نگار ملا وجہی کے سوانحی احوال و کوائف، ادبی کارناموں سے واقف ہوں گے، ان کی مشہور مثنوی 'قطب مشتری' سے بحث کریں گے اور اس کے تجزیے کے ذریعے ان کی مثنوی نگاری کی فنی انفرادیت کو سمجھیں گے۔

13.3 ملا وجہی: حیات، ادبی کارنامے اور قطب مشتری کا جائزہ

13.3.1 ملا وجہی کے سوانحی احوال و کوائف

ملا وجہی کے حالات زندگی اور ان کی شخصیت کے متعلق بہت زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں، البتہ ملا وجہی نے اپنی مثنوی میں اپنے حالات زندگی کے متعلق جو اشارے کیے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے آبا و اجداد اصلاً خراسان کے باشندے تھے۔ اکبر الدین صدیقی نے بھی وجہی کے فارسی دیوان کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کی پیدائش تو ہندوستان کی سرزمین میں ہوئی ہے لیکن ان کی طبع پاک کو خراسان سے نسبت ہے۔ حیات وجہی کے مصنف م۔ن۔ سعید کا خیال ہے کہ ملا وجہی کے آبا و اجداد ۹۷۳ھ کے قریب اپنا وطن چھوڑ کر گول کنڈہ آئے تھے۔ بہمنی عہد سے ہی دکن میں ترکی و ایرانی آکر نہ صرف اپنی زندگی گزار رہے تھے بلکہ انھیں دربار کے امور میں بھی نمایاں ذمہ داریاں ملی ہوئی تھیں۔ اس وقت خراسان میں شیعوں پر ظلم کیے جا رہے تھے اور دکن کے حالات سازگار تھے۔ لہذا وہاں سے بہت سے خاندان ہجرت کر کے دکن آگئے تھے جن میں وجہی کا خاندان بھی تھا۔ ملا وجہی کی پیدائش کس سن میں ہوئی۔ اس سلسلے میں ناقدین ادب کے الگ الگ نظریات ہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے وجہی کا سن پیدائش ۱۵۵۸/۱۵۵۵ء قرار دیا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے ۹۹۶ھ کو وجہی کا سن پیدائش بتایا ہے۔ ڈاکٹر نور السعید اختر کے مطابق وجہی کی پیدائش کا زمانہ ۱۵۶۷ء تا ۱۵۶۸ء ہے۔ بیش تر محققین نے ملا وجہی کی مشہور مثنوی 'قطب مشتری' میں موجود اندرونی شہادتوں کو بنیاد بنا کر ان کا سن ولادت متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور محمد قلی قطب شاہ کی پیدائش کے زمانے کو، ہی وجہی کا بھی سن پیدائش قرار دیا ہے۔ اکثر تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ وجہی ابراہیم قطب شاہ (۱۵۸۰ء تا ۱۵۵۰ء) کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ ملا وجہی نے طویل عمر پائی اور قطب شاہی سلطنت کے چار بادشاہوں؛ ابراہیم قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ دیکھا تھا۔ وجہی کی جائے پیدائش کے تعلق سے بھی کوئی مستند ثبوت موجود نہیں ہے لیکن وجہی نے اپنی مثنوی 'قطب مشتری' میں اپنی تعریف کے ساتھ ساتھ دکن اور تلنگانہ کی خوب تعریف کی ہے جیسا کہ درج ذیل اشعار سے ظاہر ہے:

دکن سے نگینہ انگٹھی ہے جگ
انگٹھی کو حرمت نگینہ ہے لگ
دکن ملک کو دھن عجب ساج ہے
کہ سب ملک سر اور دکن تاج ہے

ملا وجہی: حیات، ادبی کارنامے اور قطب مشتری کا جائزہ

دکن کی تعریف میں مذکورہ بالا اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وجہی گول کنڈہ ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ ملا وجہی کے بعد کے دوسرے شعرا نے بھی انھیں ملک دکن کا ہی شاعر قرار دیا ہے۔ وجہی کا اصل نام اسد اللہ تھا۔ شاعری میں انھوں نے اپنے لیے کئی تخلص کا استعمال کیا ہے۔ وجیاء، وجیہہ، وجیہی اور وجیہی ان کے مختلف تخلص ہیں۔ وجہی کا ہم عصر شاعر غواصی نے انھیں وجہی کے تخلص سے یاد کیا ہے اور ان کا یہی تخلص عوام و خواص میں مشہور ہے۔ ملا وجہی نے اپنے ایک فارسی شعر میں اپنا نام و تخلص اس طرح بیان کیا ہے:

اسم اسد اللہ وجہہ است تخلص
آرائش دکانچہ بازار کلام است

وجہی کے ابتدائی حالات اور ان کی تعلیم و تربیت کے بارے میں تذکروں میں تشریفی بخش معلومات درج نہیں ہیں۔ البتہ م۔ن۔ سعید نے اپنی کتاب ’حیات وجہی‘ میں اپنی تحقیقی کاوشوں سے وجہی کے کچھ ابتدائی نقوش اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وجہی کے آبا و اجداد علم و ادب کے زیور سے آراستہ تھے۔ جب وہ ترک وطن کر کے گول کنڈہ پہنچے تو انھیں ان کی علمی حیثیت کے پیش نظر دربار میں کوئی نہ کوئی ذمہ داری دی گئی ہوگی جو اس زمانے کا دستور تھا۔ ان کے مطابق ملا وجہی نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں جہاں فارغ البالی اور خوش حالی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وجہی کی تربیت اس خوش گوار ماحول اور دکنی تہذیب و تمدن میں ہوئی تھی۔ ملا وجہی کو مذہبی طور پر شیعہ عقائد کا مانے والا بتایا گیا ہے۔ ایسا اس لیے بھی ہے کہ انھوں نے اپنی مثنوی میں نعت کے بالمقابل حضرت علی کی مدح میں کثرت سے اشعار کہے ہیں۔ اسی طرح حضرت علی کو خلفائے راشدین میں سب سے افضل قرار دیا ہے۔ رشید خان نے اپنی کتاب ’اُردو کی تین مثنویاں‘ میں اسی نظریے کو تسلیم کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

’ملا وجہی خود بھی شیعہ مسلک تھا۔ قطب مشتری میں اس کے بے شمار شواہد موجود ہیں۔ نعت کے ۲۶ اشعار ہیں۔ اس کے مقابلے میں منقبت تقریباً پچاس اشعار پر مشتمل ہے۔ اگر ذکر معراج کے اشعار بھی نعت میں شامل کر لیے جائیں تو ان کی تعداد ۶۰ ہو جاتی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذکر معراج بھی حضرت علی کی فضیلت اور بزرگی

بتلانے کے لیے کیا گیا ہے۔“

(پروفیسر خان رشید، اُردو کی تین مثنویاں، چین بک ڈپو، دہلی، ۱۹۶۸ء، ص: ۸۵)

حالاں کہ اس سبب سے ان کے مذہبی عقائد کے بارے میں فیصلہ کرنا محل نظر ہے۔ جہاں تک شعر و شاعری کی بات ہے تو ملا وجہی کو کم عمری سے ہی شعر و ادب سے گہری دل چسپی تھی۔ انھوں نے بچپن سے ہی شعر گوئی کا سلسلہ شروع کر دیا تھا لیکن انھیں شہرت قلی قطب شاہ کے عہد میں حاصل ہوئی اور ان ہی کے دربار سے وابستہ ہو کر وہ ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز کیے گئے۔ اس حوالے سے جاوید وششٹ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

”محمد قلی کے عہد میں اس کی شہرت و مقبولیت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا تھا۔ وہ قطب شاہی دربار کا سب سے بڑا شاعر اور گول کٹہہ کا ملک الشعرا تھا۔“

(جاوید وششٹ، ملا وجہی، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص: ۲۵)

ملا وجہی: حیات، ادبی کارنامے اور قطب مشتری کا جائزہ

محمد قلی قطب شاہ کی قربت نے جب ملا وجہی کی زندگی کو قابل رشک بنا دیا تو ان کے حاسدین کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ قلی قطب شاہ کے بعد جب محمد قطب شاہ سلطان بادشاہ بنے تو حاسدوں نے وجہی کے خلاف انھیں بھڑکا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب ملا وجہی کا وہ مرتبہ نہ رہا جو قلی قطب شاہ کے عہد میں تھا۔ اس دور میں انھیں بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن محمد قطب شاہ کی وفات کے بعد جب عبداللہ قطب شاہ بادشاہ بنے تو وجہی کے اچھے دن پھر واپس آ گئے اور وہ دوبارہ دربار سے وابستہ ہو گئے۔ عبداللہ قطب شاہ نے وجہی کے علمی مقام و مرتبے کو سمجھتے ہوئے ان سے کتاب لکھنے کی فرمائش کی اور ملا وجہی نے اُردو کی مشہور تمثیلی داستان ’سب رس‘ لکھی جس کے تذکرے کے بغیر اردو نثر کی کوئی تاریخ مکمل نہیں کہی جاسکتی۔

ملا وجہی کی وفات سے متعلق بھی کوئی مستند حوالہ کسی تذکروں میں نہیں ملتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ۱۰۷۰ھ/ ۱۶۵۹ء کو وجہی کا سن وفات قرار دیا ہے جس پر پیش تر محققین نے اتفاق بھی کیا ہے۔ البتہ جاوید وششٹ جنھوں نے وجہی کے تعلق سے اہم تحقیقی کام کیا ہے، کی رائے مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”حق بات تو یہ ہے کہ وجہی کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات دونوں پر لاعلمی کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔ محققین نے اس پردے کو اٹھانے کی کوشش میں جو قیاس آرائیاں کی ہیں، ان سے معاملہ کچھ اور الجھ گیا۔ وجہی نے بھی اپنی کسی تصنیف میں اس گتھی کو نہیں سلجھایا۔“

ڈاکٹر زور نے ”تذکرہ مخطوطات“ جلد چہارم میں لکھا ہے کہ ملا وجہی روحانی طور پر سید حسن برہنہ شاہ کے معتقد تھے اور عبداللہ قطب شاہ کے امیر مالک پرست خان نے برہنہ شاہ کی درگاہ کی تعمیر مکمل کی تھی۔ اسی درگاہ کے احاطہ میں اسد اللہ وجہی کے دفن ہونے کا ذکر ملتا ہے۔

13.3.2 ملا وجہی کے ادبی کارنامے

ملا وجہی دکن کے ممتاز شاعر اور باکمال نثر نگار تھے۔ انھیں فارسی اور دکنی دونوں زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔ عربی زبان سے بھی اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ وجہی کا مطالعہ وسیع تھا۔ ان کی طبیعت خلافتانہ تھی۔ خدا نے انھیں بہترین قوت حافظہ، ذہانت اور وسعت نظر عطا کی تھی۔ انھوں نے فارسی کے اعلیٰ ترین ادب کے ساتھ حافظ شیرازی، سعدی، خاقانی، عربی، حسن اور کمال جیسے شعرا کا گہرا مطالعہ کیا تھا جس کا اظہار انھوں نے اپنے اشعار میں جاہ جاکیا ہے۔ ہندوستانی زبانوں اور علوم سے بھی انھیں گہری واقفیت تھی۔ ہندو دیومالا، رامائن اور مہا بھارت جیسے عظیم رزمیوں پر ان کی گہری نظر تھی جس کا ذکر وجہی نے اپنی تحریروں میں بار بار کیا ہے۔ م۔ن۔ سعید نے ان کی علمی و ادبی صلاحیت سے متعلق لکھا ہے:

”حقیقت یہ ہے کہ اس نے تحصیل علم کے شوق کو تا حیات باقی رکھا۔ تاریخی ترتیب سے اس کی ہر کتاب پچھلی کتاب سے زیادہ معلومات انگیز اور وسیع ہے لیکن عہد شباب میں جہاں وہ فارسی، عربی ادبیات کا مطالعہ جاں فشانی سے کر رہا تھا اور اپنے علم میں مسلسل اضافے کر رہا تھا، وہیں اپنے ماحول کی ادبی اور لسانی روایات کو پورے انہماک سے سمجھنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔“

(م۔ن۔ سعید، حیات وجہی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء ص: ۳۴-۳۷)

وجہی اظہار و بیان پر بے پناہ قدرت رکھتے تھے۔ انھوں نے بہت کی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں جن میں ’قطب مشتری‘، ’سب رس‘ اور ’تاج الحقائق‘ جیسی مشہور کتابوں کے علاوہ ’ماہ سیما و پری رخ‘، ’صراط المستقیم فی دین تویم‘، فارسی دیوان اور دکنی غزلیں وغیرہ قابل ذکر ہیں جو دستیاب ہیں۔

’قطب مشتری‘ سے متعلق تفصیلی بحث آئندہ صفحات میں کی جائے گی۔ یہاں وجہی کی دیگر تصانیف کے بارے میں ضروری معلومات پیش کی جا رہی ہیں۔

مثنوی 'قطب مشتری' ملا وجہی کے کمال فن کا شاہ کار ہے۔ ملا وجہی نے ایک اور مثنوی 'ماہ سیما و پری رخ' کے نام سے تحریر کی تھی جس کا ذکر کئی محققین نے کیا ہے۔ گارساں دتاسی نے اپنے خطبات میں اسے وجہی کی دوسری مثنوی قرار دیا ہے جب کہ پروفیسر ضامن علی نے اپنی کتاب 'جائزہ زبان اُردو' میں لکھا ہے کہ اس کا ایک نسخہ محمد حفیظ الہ آبادی کے کتب خانے میں محفوظ ہے لیکن یہ بات تحقیق طلب ہے۔

دیوان وجہہ فارسی:

محققین نے لکھا ہے کہ وجہی کئی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ وہ نہ صرف فارسی زبان اور اس کی ادبیات سے گہری واقفیت رکھتے بلکہ خود بھی فارسی کے بڑے شاعر تھے۔ اس کا ثبوت ان کا فارسی دیوان ہے جس کے بارے میں جاوید وششٹ نے لکھا ہے:

’دیوان وجہی (فارسی) کا ایک نادر و نایاب قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ اس کی دریافت کا سہرا پروفیسر اختر حسن کے سر ہے۔ میں نے وجہی کے فارسی دیوان کا انتخاب ’آشوب دل‘ کے نام سے مرتب کیا ہے۔‘

(جاوید وششٹ، ملا وجہی، ساہتیہ اکادمی، دہلی ۱۹۸۴ء ص: ۵۹)

ملا وجہی: حیات، ادبی کارنامے اور قطب مشتری کا جائزہ

تاج الحقائق:

شاعری کے علاوہ نثر میں ملا وجہی کی پہلی یادگار تصنیف 'تاج الحقائق' ہے۔ یہ کتاب تصوف کے موضوع پر ایک اہم تصنیف ہے۔ حالاں کہ اس سلسلے میں محققین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ تصنیف ملا وجہی کی ہے یا کسی اور کی۔ مولوی عبدالحق نے 'سب رس' کے مقدمے میں اسے وجہی کی تصنیف قرار دیا ہے۔ محمود شیرانی، عبد القادر سروری اور اکبر الدین صدیقی کا بھی یہی موقف ہے جب کہ ڈاکٹر مسعود حسین اس سے اتفاق نہیں رکھتے۔ نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اسے میراں جی شمس العشاق کی تصنیف بتایا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانیہ اور گیان چند جین نے اسے وجہی الدین گجراتی کی کتاب قرار دیا ہے۔ اس کتاب کو سب سے پہلے ڈاکٹر نور السعید اختر نے ترتیب و تدوین کر کے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا ہے۔ اس تعلق سے ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے لکھا ہے:

ملا وجہی: حیات، ادبی کارنامے اور
’قطب مشتری‘ کا جائزہ

’اس کتاب (تاج الحقائق) کی تدوین و ترتیب کر کے ڈاکٹر نور السعید اختر نے سب
سے پہلے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا اور یہ ثابت کیا کہ یہ ملا وجہی ہی کی تصنیف ہے اور اس کا
اصلی نام ’تاج الحقائق‘ ہی ہے۔“

(ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، ملا وجہی اور انشائیہ ایک تحقیقی مطالعہ حسن پبلی کیشن ممبئی، ۱۹۸۸ء ص: ۴۵)

سب رس:

ملا وجہی کی مشہور تصنیف ’سب رس‘ ایک تمثیلی داستان ہے۔ یہ کتاب انھوں نے عبداللہ قطب شاہ کی خصوصی
فرمائش پر ۱۰۴۵ھ بمطابق ۱۶۳۵ء میں تحریر کی تھی۔ اس کتاب کو اردو میں غیر مذہبی نثر کا سب سے پہلا مکمل نمونہ
تسلیم کیا جاتا ہے۔ ملا وجہی نے اس کتاب میں عشق و دل کے معرکے کو تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے اور اپنی
انشا پردازی کے جوہر دکھائے ہیں۔ وجہی نے اس کتاب میں نظم و نثر کو ملا کر ایک جدید طرز ایجاد کی ہے۔ اس
کتاب پر ملا وجہی کو بہت فخر تھا۔

محققین نے وجہی کی مذکورہ کتابوں کے علاوہ اور بھی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے اس حوالے
سے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے، ان میں ایک کتاب ’صراط المستقیم فی دین تویم‘ ہے جس کا مخطوطہ کتب خانہ سالار
جنگ، حیدرآباد میں موجود ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ ڈاکٹر جمال شریف نے اپنی کتاب ’دکن میں
اردو شاعری‘ ولی سے پہلے میں وجہی کی ایک اور کتاب ’عقائد وجہی‘ کا ذکر کیا ہے۔ مختصر یہ کہ ملا وجہی نے کئی یادگار
تصانیف چھوڑی ہیں اور ’قطب مشتری‘ اور ’سب رس‘ ان کی مشہور ترین کتابیں ہیں۔

13.3.3 ملا وجہی کی مثنوی ’قطب مشتری‘ کا جائزہ

ملا وجہی کی مثنوی ’قطب مشتری‘ کو دکنی مثنویوں میں سنگ میل کا درجہ حاصل ہے۔ اس مثنوی کو سب سے پہلے
مولوی عبدالحق نے ۱۹۳۸ء میں انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی سے شائع کیا۔ مولوی عبدالحق کے مطابق ’قطب
مشتری‘ کا زمانہ تصنیف ۱۰۱۸ھ بمطابق ۱۶۰۹ء ہے اور یہ مثنوی صرف بارہ دن میں تحریر کی گئی تھی جیسا کہ خود وجہی
نے لکھا ہے کہ ۱۰۱۸ھ میں تصنیف ہوئی۔

تمام اس کیا دیس بارا منے
سنہ ایک ہزار ہور اٹھارا منے

یعنی ۱۰۱۸ھ میں بارہ دن میں لکھ کر پوری کر دی۔ محققین کی عام رائے ہے کہ ’قطب مشتری‘ کا قصہ بھاگ متی اور محمد قلی قطب شاہ کے عشق کی داستان ہے لیکن کچھ محققین اس رائے سے اختلاف کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے ’قطب مشتری‘ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ’’اس میں درپردہ سلطان محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کے مشہور عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ وہ واقعہ بھی عالم شہزادگی کا ہے۔ ممکن ہے ایسا ہو لیکن کتاب سے اس کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔‘‘ مثنوی میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، بھاگ متی کے عشق سے ان کا کوئی تعلق نہیں پایا جاتا۔ وجہی کا مقصد اس مثنوی کے لکھنے سے بادشاہ کے حسن و جمال، شجاعت اور لیاقت کی تعریف کرنا ہے اور بس۔ سیدہ جعفر نے بھی کلیات قلی قطب شاہ کے مقدمے میں ’قطب مشتری‘ کو وجہی کا خالص تخیلی اور رومانی قصہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس کا محمد قلی قطب شاہ کی حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر خان رشید وغیرہ نے اس تصنیف کے قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کی داستان ہونے کو زیادہ قرین قیاس مانا ہے۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی نے بھی اسی موقف کو اختیار کیا ہے اور تمام تر تحقیقات پر نظر ڈالنے کے بعد لکھا ہے:

’’بھاگ متی اور قلی قطب شاہ کا عشق کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی جو وجہی کے لیے اسے پس منظر بنانا ناقابل عمل ہوتا یا مصلحت کے خلاف بات ہوتی۔ قطب شاہی دور کی تاریخوں کے علاوہ خود قلی قطب شاہ کے کلام میں اس کے اشارے موجود ہیں۔ نظم ’جلوہ‘ اور ’بارہ پیاریاں‘ میں بھاگ متی کا ذکر ہے نیز کلیات کے صفحہ ۹۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۲۱۷، ۲۵۷، ۲۶۸ اور ۳۱۲ پر صریحاً بھاگ متی کے متعلق گتھی کو بہ خوبی سمجھا دیا ہے۔ زور لکھتے ہیں کہ محمد قلی نے بھاگ متی کو خود ہی حیدر محل کا خطاب دیا تھا۔ یہ اشارہ تھا اس کی اس خواہش کی طرف کہ اس کی محبوبہ کو اس کے اصلی نام سے کوئی یاد نہ کرے اور صرف خطاب یاد رکھے۔ اسی مصلحت سے تو اس نے اپنے شہر کا نام بھاگ نگر سے حیدر آباد بدل دیا تھا۔ مصنف تاریخ فرشتہ نے اسے فاحشہ لکھ دیا تھا۔ اسی واقعہ کی پردہ پوشی کے لیے قطب شاہی عہد میں اتنے جتن کیے گئے کہ درباری شاعر ملا وجہی سے ایک مثنوی بہ طور خاص بھاگ متی کی وفات پر ۱۰۱۷ھ کے بعد لکھوائی گئی جس میں اصل واقعہ کو کچھ اس طرح بدل دیا گیا۔‘‘

(وہاب اشرفی، قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ، ایجوکیشنل پبلسنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص: ۲۸)

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ ’قطب مشتری‘ میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے، اس کا تعلق مشہور رقصہ بھاگ متی اور محمد قلی قطب شاہ کے داستان عشق سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قلی قطب شاہ نوجوانی میں اس پر عاشق ہو گئے تھے۔ بادشاہ

کے سماجی رتبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے وجہی نے بھاگ متی کو مشتری کا رُوپ دے کر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس مثنوی کا مرکزی کردار دکن کا شہزادہ محمد قلی قطب شاہ ہے۔ اس کی ہیروئن بنگال نگر کی شہزادی مشتری ہے اور یہی بھاگ متی ہے جو محمد قلی قطب شاہ کی محبوبہ ہے۔

یہ مثنوی ایک منظوم طرہ پر قصہ پر مشتمل ہے۔ کہانی کا آغاز روایتی ہے۔ یہاں بھی پرانی داستانوں کی طرح ابراہیم قطب شاہ کے لادلد ہونے کے منظر سے مثنوی کا آغاز ہوا ہے۔ ہزار منتوں کے بعد اس کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام محمد قلی قطب شاہ رکھا گیا۔ شہزادے کی تعلیم و تربیت کا بہترین نظم کیا گیا۔ دھیرے دھیرے شہزادہ جوان ہوا۔ ایک رات عیش و مستی کی شاہی مجلس سچی، شراب کے دور چلے اور اسی عالم میں شہزادہ نیند کی آغوش میں جا پھنچا۔ نیند میں اس نے ایک خواب دیکھا جس میں اسے ایک پری رخ نازنین نظر آئی جس پر وہ دل و جان سے عاشق ہو گیا۔ اس کا مرض عشق بڑھتا گیا۔ ماں باپ اس کی حالت دیکھ کر مجبور ہو گئے اور اسے اپنے دوست عطار د کے ساتھ خواب کی شہزادی کی تلاش میں نکلنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ شہزادہ تلاش معشوق میں نکلتا ہے اور بے شمار پریشانیوں کے بعد اپنی محبوبہ ’مشتری‘ کو پالیتا ہے۔ یہیں کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ ’قطب مشتری‘ کی پوری کہانی اس مختصر اور سادے سے پلاٹ کے ارد گرد گھومتی ہے۔

اس پورے پلاٹ میں مافوق الفطری عناصر سے کام لیا گیا ہے۔ حالاں کہ قطب اور مشتری جیسے کردار حقیقی ہو سکتے تھے لیکن جس طرح کے واقعات یا حادثات مثنوی کے قصے میں پیش آئے ہیں، وہ خلاف حقیقت ہیں جن کا تعلق مافوق الفطری مظاہر سے ہے۔ کہانی خواب کے دھندلے نقوش سے شروع ہوتی ہے اور شہزادہ خوب رُو دوشیزہ کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ خواب میں دیکھی گئی دوشیزہ کی تلاش کا عمل شروع ہوتا ہے۔ پھر مشہور زمانہ مصور عطار د ایک تصویر دکھاتا ہے اور شہزادے کو اس کے خوابوں کی دوشیزہ کی تصویر مل جاتی ہے۔ اب دکن سے ارض بنگالہ تک کا سفر شروع ہوتا ہے جس میں شہزادے کو مصیبتوں، اذیتوں اور پریشانیوں کا جگہ جگہ سامنا ہوتا ہے۔ فوق الفطری ماحول کی تشکیل ہوتی ہے اور عجیب الخلق کردار سامنے آتے ہیں۔ اثر رہا اپنے منہ سے آگ اُگلتا ہے جس سے مقابلہ ہوتا ہے۔ تین سر، چار ہاتھ اور بڑے بڑے دانتوں والا راکشس سامنے آتا ہے جو ہر صبح نو ہاتھیوں کا ناشتہ کرتا ہے۔ اس کو شکست دینے کے لیے شہزادہ آیینہ الکرسی کا حصار باندھتا ہے اور راک راکشس کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ راکشس کا ذکر وجہی کچھ یوں کرتے ہیں:

ووراکشس کے بالاں میں سانپاں ہیں یوں

چچوندے پڑے اچتے بیلاں ہیں جیوں

صبا اٹ نہاری کرے نو ہتی

کہ ملعون وو ہے بڑا نکلیتی

پوری کہانی میں فوق فطری عناصر کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے ہیرو غیر معمولی حسن، قوت و طاقت اور صلاحیت کے مالک ہیں جن کو دیکھ کر چاند اور سورج شرمندہ ہوتے ہیں۔ وہ دیو اور راکشس کو مغلوب کر سکتے ہیں۔ جنگی فنون میں ماہر ہونے کے باوجود مقابلے کے وقت وہ اپنی صلاحیتوں کا اظہار نہیں کرتے بلکہ کوئی فقیر، سادھو، مہاتما، پیر یا خضر سامنے آتے ہیں یا پھر وہ خود دعائیں، اسم اعظم یا کوئی منتر پڑھ کر یا پھر اپنی تعویذ چوم کر دعا کرتے ہیں اور فتح یاب ہوتے ہیں۔ یہ تمام تر مظاہر، کردار اور حادثات و واقعات ما فوق الفطرت ہی ہیں۔

اس مثنوی کو ملا وجہی نے گیارہ کرداروں کے سہارے تشکیل دیا ہے۔ ابراہیم قطب شاہ، قلی قطب شاہ، عطار، مشتری، زہرہ، مرتخ خاں، شاہ سرطان، وزیر اسد خاں، مہتاب پری سلکھن پری، مہرواں دانی وغیرہ اہم کردار ہیں۔ کہانی کا مرکزی کردار قلی قطب شاہ ہے جن کے گرد سارا پلاٹ بنا گیا ہے۔ وجہی نے اس کردار کو مثالی شخصیت کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثنوی میں داستانوی کردار بار بار سامنے آتے ہیں۔ شہزادے میں فوق فطری عادتیں ہر موڑ پر نظر آتی ہیں۔ مثلاً اس کی ولادت کے وقت چاند کے پانسے ڈال کر سورج نے بتایا کہ شہزادہ علم و آگہی میں اپنی مثال آپ ہے۔ ذہانت و فطانت میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ قوی و بہادر اتنا کہ مست ہاتھیوں کو چھڑا دے مگر پورے قصبے میں اس کا عمل دیکھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ انتہائی معمولی قسم کا فرد ہے۔ خواب میں دیکھی ہوئی محبوبہ کو اس روئے زمین پر تلاش کرنے نکل جاتا ہے۔ یہی نہیں اس سفر میں انتہائی ہیبت ناک اژدہ کو موت کی نیند سلاتا ہے۔ ساتھ ہی ایک ایسے راکشس کو اپنی تلوار سے ڈھیر کرتا ہے جو نو ہاتھیوں کا ناشتہ کرتا ہے۔ وجہی نے قطب کے کردار کو پیش کرنے کے لیے ایسی طلسماتی اور تخریب خیز فضا قائم کی ہے کہ اس کی شخصیت کا درست سراہی نہیں مل پاتا۔ قاری یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ آیا یہ کردار انسان ہے یا پھر اس کا تعلق جن و دیو کے قبیل سے ہے کیوں کہ وجہی کی پیش کردہ تصویر اور اس کے نقوش و حرکات سے یہ کردار ما فوق فطری اور حقیقی دنیا کے کردار کے درمیان معلق ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کردار کی ایک اہم بات یہ ہے کہ یہ اپنے مقصد عشق کے حصول میں کبھی کوتاہی نہیں برتا۔ اسے عطار کے مشورے کی ضرورت ضرور پڑتی ہے اور وہ سفر کے راستے میں آنے والی پریشانیوں سے اسے ڈراتا بھی ہے لیکن یہ پیچھے نہیں ہٹتا اور عشق کی راہ میں آنے والی تمام تر رکاوٹوں کو دور کرتا ہوا اپنے معشوق سے ملنے کی جدوجہد کرتا رہتا ہے۔

مثنوی کا دوسرا اہم اور مرکزی کردار 'مشتری' ہے جو بنگال کی شہزادی ہے جو حسن و جمال میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ سخاوت اس کی پہچان ہے۔ فن کاروں کی قدردان ہے۔ وفا شعاری اور ثابت قدمی اس کی شخصیت کا بنیادی وصف ہے۔ اسی لیے وہ اپنی ریاست چھوڑ کر اپنے محبوب کے ساتھ روانہ ہونے سے گریز نہیں کرتی ہے۔ فنی لحاظ سے اس مثنوی میں کئی خوبیاں ہیں۔ اس مثنوی کے مکالمے اور کرداروں کی باہمی گفتگو نہایت مناسب، برجستہ اور بر محل ہے۔ وجہی نے پوری کوشش کی ہے کہ کرداروں کے معاشرتی رتبے کو دھیان میں رکھتے ہوئے ان سے مکالمے ادا کرائے جائیں۔ اس مثنوی کی ایک خصوصیت اس میں موجود جذبات نگاری ہے۔ دراصل وجہی کو

انسانی نفسیات اور جذبات کا گہرا شعور تھا۔ ملا وجہی نے اس مثنوی میں کئی مقامات پر جذبات نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ منظر نگاری کے معاملے میں بھی اس مثنوی کو نمایاں مقام حاصل ہے اور اس وقت کے لحاظ سے منظر نگاری کے عمدہ نمونے اس میں موجود ہیں۔ وجہی نے اس مثنوی میں داستانِ عشق بیان کرتے ہوئے اس عہد کی معاشرتی اور تمدنی جھلک بھی پیش کی ہے۔ اس عہد کے دربار، توہمات، عقائد، اقدار، روایات اور سامانِ آرائش و زیبائش کے علاوہ متعدد معاشرتی اور تمدنی تفصیلات بھی اس میں موجود ہیں۔ اس سے پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ ملا وجہی کئی زبانوں سے واقف تھے بالخصوص دکنی زبان پر انھیں عبور حاصل تھا۔ اس کی جھلک بھی اس مثنوی میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس مثنوی میں سلاست، روانی اور متانت بدرجہ اتم موجود ہے۔ وجہی نے تشبیل الفاظ سے گریز کیا ہے۔ فارسی، عربی اور ہندی الفاظ سے بھرپور استفادہ کیا ہے اور ہر شعر اور ہر جذبے کے لیے مناسب و موزوں لفظ استعمال کیا ہے۔ محاورے، روزمرہ، تراکیب اور نادر تشبیہات و استعارات کو بہت ہنرمندی سے برتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھیں تو اس مثنوی میں وجہی کی زبان میں جدت و ندرت اور وسعت و رنگنگاری ملتی ہے۔ ان کی زبان نہایت سادہ، سلیس اور شگفتہ ہے۔ چونکہ یہ کتاب اُردو کے ابتدائی نمونوں میں سے ہے، اس لیے بہت سی خامیاں بھی درآگئی ہیں۔ اس کے باوجود ادبی روایت میں اس کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔ مولوی عبدالحق نے مثنوی ’قطب مشتری‘ کے مقدمے میں لکھا ہے:

”اس اعتبار سے ’قطب مشتری‘ قدیم ہے اور اس زمانے کا ایسا مرتب

کلام کم مانتا ہے۔ قابلِ قدر ہے۔“

(مولوی عبدالحق، قطب مشتری، انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۳۹ء، ص: ۳)

13.3.4 ماحصل

ملا وجہی قطب شاہی دور کے بلند پایہ اور قادر الکلام شاعر و نثر نگار ہیں۔ ان کے آبا و اجداد اصلاً خراسان کے باشندے تھے۔ ’حیات وجہی‘ کے مصنف م۔ن۔ سعید کا خیال ہے کہ ملا وجہی کے آبا و اجداد ۱۷۷۳ء کے قریب اپنا وطن چھوڑ کر گول کنڈہ آئے تھے۔ ملا وجہی کی پیدائش کے سلسلے میں پیش تر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ابراہیم قطب شاہ (۱۵۸۰-۱۵۵۰ء) کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے طویل عمر پائی اور قطب شاہی سلطنت کے چار بادشاہوں؛ ابراہیم قطب شاہ محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ دیکھا۔ قرین قیاس ہے کہ وہ گول کنڈہ ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا اصل نام اسد اللہ تھا۔ شاعری میں انھوں نے اپنے لیے کئی تخلص کا استعمال کیا ہے لیکن عوام و خواص میں ان کا تخلص ’جہی‘ مشہور ہے۔ ملا وجہی کے آبا و اجداد علم و ادب کے زیور سے آراستہ تھے۔ انھوں نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں جہاں فارغ البالی اور خوش حالی تھی۔ اسی خوش گوار ماحول اور دکنی تہذیب و تمدن میں ان کی تربیت ہوئی تھی۔ ملا وجہی کو شعر و ادب سے بچپن سے دلچسپی

تھی لیکن انھیں شہرت قلی قطب شاہ کے عہد میں حاصل ہوئی اور ان ہی کے دربار سے وابستہ ہو کر وہ ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز کیے گئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق ۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء میں ان کی وفات ہوئی اور برہنہ شاہ کی درگاہ کے احاطے میں ان کے مدفون ہونے کا ذکر ملتا ہے۔

وجہی نے کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کی مشہور ترین تصنیفات میں ’سب رس‘، ’قطب مشتری‘، ’تاج الحقائق‘ اور فارسی دیوان شامل ہیں۔ ’قطب مشتری‘ ان کی مشہور مثنوی ہے جس میں انھوں نے بھاگ متی اور قلی قطب شاہ کی داستان عشق کو منظوم انداز میں پیش کیا ہے۔ اس مثنوی میں وجہی کی زبان میں جدت و ندرت اور وسعت و رنگارنگی مانتی ہے۔ ان کی زبان نہایت سادہ، سلیس اور شگفتہ ہے۔ چوں کہ یہ کتاب اُردو کے ابتدائی نمونوں میں سے ہے، اس لیے بہت سی خامیاں بھی درآئی ہیں۔ اس کے باوجود یہ مثنوی اُردو کی ادبی روایت میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔

13.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- ملا وجہی کے سوانحی احوال و کوائف سے واقفیت حاصل کی۔
- ملا وجہی کے ادبی کارناموں کے بارے میں معلومات حاصل کی۔
- ملا وجہی کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے آگہی حاصل کی۔
- ملا وجہی کی مشہور مثنوی ’قطب مشتری‘ سے بحث کی۔
- ملا وجہی کی مثنوی ’قطب مشتری‘ کے تجزیے کے ذریعے اس کی انفرادیت کو سمجھا۔

13.5 اپنا امتحان خود لیجیے

- ۱۔ ملا وجہی کے سوانحی احوال و کوائف پر مختصراً اظہارِ خیال کیجیے۔
- ۲۔ ملا وجہی اور قلی قطب شاہ کے مابین تعلقات پر مختصر روشنی ڈالیے۔
- ۳۔ ملا وجہی نے جو شعری و نثری یادگار چھوڑی ہیں، ان کے نام بتائیے۔
- ۴۔ ’سب رس‘ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
- ۵۔ ملا وجہی کی مثنوی ’قطب مشتری‘ کے بارے میں اپنی معلومات درج کیجیے۔

۱۔ ملا وجہی کے حالات زندگی اور ان کی شخصیت کے متعلق بہت زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں لیکن ان کی مثنوی سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے آبا و اجداد اصلاً خراسان کے باشندے تھے۔ 'حیات وجہی' کے مصنف م۔ن۔سعد کا خیال ہے کہ ملا وجہی کے آبا و اجداد ۹۷۳ھ کے قریب اپنا وطن چھوڑ کر گول کنڈہ آئے تھے۔ وجہی کا اصل نام اسد اللہ اور تخلص وجہی تھا۔ ملا وجہی کی پیدائش کے سلسلے میں بیش تر محققین اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ابراہیم قطب شاہ (۱۵۸۰ء۔۱۵۵۰ء) کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے طویل عمر پائی اور قطب شاہی سلطنت کے چار بادشاہوں؛ ابراہیم قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ دیکھا۔ قرین قیاس ہے کہ وہ گول کنڈہ ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق ۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء ان کا سن وفات ہے جس سے بیش تر محققین نے بھی اتفاق کیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے 'تذکرہ مخطوطات' جلد چہارم میں لکھا ہے کہ ملا وجہی روحانی طور پر سید حسن برہنہ شاہ کے معتقد تھے اور عبداللہ قطب شاہ کے امیر مالک پرست خان نے برہنہ شاہ کی درگاہ کی تعمیر مکمل کی تھی۔ اسی درگاہ کے احاطے میں اسد اللہ وجہی کے دفن ہونے کا ذکر ملتا ہے۔

۲۔ قلی قطب شاہ سے ملا وجہی کی قربت کا اظہار ان کی شاہ کار مثنوی 'قطب مشتری' میں ہوا ہے۔ ملا وجہی نے کم عمری ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن انھیں شہرت قلی قطب شاہ کے عہد میں حاصل ہوئی اور ان ہی کے دربار سے وابستہ ہو کر وہ ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ وہ بادشاہ کے ہر رزم و بزم میں شریک رہے۔

۳۔ ملا وجہی نے جو شعری و نثری یادگار چھوڑی ہیں، ان میں 'قطب مشتری'، 'سب رس' اور 'تاج الحقائق' جیسی مشہور کتابوں کے علاوہ ماہ سیما و پری رخ، 'صراط المستقیم فی دین توہم' فارسی دیوان اور دکنی غزلیں وغیرہ قابل ذکر ہیں جو دستیاب ہیں۔

۴۔ ملا وجہی کی مشہور تصنیف 'سب رس' ایک تمثیلی داستان ہے۔ یہ کتاب انھوں نے عبداللہ قطب شاہ کی خصوصی فرمائش پر ۱۰۴۵ھ بمطابق ۱۶۳۵ء میں تحریر کی تھی۔ اس کتاب کو اردو میں غیر مند ہی نثر کا سب سے پہلا مکمل نمونہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ملا وجہی نے اس کتاب میں عشق و دل کے معرکے کو تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا ہے اور اپنی انشا پر دازی کے جوہر دکھائے ہیں۔ وجہی نے اس کتاب میں نظم و نثر کو ملا کر ایک جدید طرز ایجاد کی ہے۔ اس کتاب پر ملا وجہی کو بہت فخر تھا۔

۵۔ ملا وجہی کی مثنوی 'قطب مشتری' کو اردو ادبیات میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس مثنوی کو سب سے

پہلے مولوی عبدالحق نے ۱۹۳۸ء میں انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی سے شائع کیا۔ مثنوی کا زمانہ تصنیف ۱۰۱۸ھ بمطابق ۱۶۰۹ء ہے۔ یہ مثنوی صرف بارہ دن میں لکھی گئی تھی۔ اس کا موضوع ایک رقصہ بھاگ متی اور محمد قلی قطب شاہ کے عشق کی داستان ہے۔ اس مثنوی کا ایک مرکزی کردار دکن کا شہزادہ محمد قلی قطب شاہ ہے اور دوسرا مرکزی کردار قلی قطب شاہ کی ہیروئن بنگال نگر کی شہزادی مشتری ہے۔ یہی مشتری بھاگ متی ہے جو محمد قلی قطب شاہ کی محبوبہ ہے۔ ان ہی دونوں کرداروں کے گرد سارا پلاٹ بنا گیا ہے۔ ان کے علاوہ ابراہیم قطب شاہ عطار، زہرہ، مرتخ، خاں شاہ سرطان، وزیر اسد خاں، مہتاب پری سلکھن پری، مہرواں دائی وغیرہ اہم کردار ہیں۔ فنی لحاظ سے اس مثنوی کے مکالمے اور کرداروں کی باہمی گفتگو نہایت مناسب، برجستہ اور بر محل ہے۔ وجہی نے کرداروں کے معاشرتی رتبے کو دھیان میں رکھتے ہوئے ان سے مکالمے ادا کرائے ہیں۔ اس مثنوی کی ایک خصوصیت جذبات نگاری ہے۔ وجہی نے انسانی نفسیات اور جذبات کی فطری عکاسی کر کے مثنوی میں جذبات نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ منظر نگاری کے معاملے میں بھی اس مثنوی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ وجہی نے داستان عشق کے پس منظر میں اس عہد کی معاشرتی اور تمدنی جھلک بھی پیش کی ہے۔ اس عہد کے دربار، توہمات، عقائد، اقدار، روایات اور سامانِ آرائش و زیبائش کے علاوہ متعدد معاشرتی اور تمدنی تفصیلات بھی اس میں موجود ہیں۔ اس مثنوی میں سلاست، روانی اور متانت بدرجہ اتم موجود ہے۔ وجہی نے ثقیل الفاظ سے گریز کیا ہے۔ فارسی، عربی اور ہندی الفاظ سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ محاورے، روزمرہ، تراکیب اور نادر تشبیہات و استعارات کو بہت ہنرمندی سے برتا ہے۔ اس مثنوی میں وجہی کی زبان میں جدت و ندرت اور وسعت و رنگارنگی ملتی ہے۔ ان کی زبان نہایت سادہ، سلیس اور شگفتہ ہے۔ چونکہ یہ کتاب اُردو کے ابتدائی نمونوں میں سے ہے، اس لیے بہت سی خامیاں درآئی ہیں۔ اس کے باوجود ادبی روایت میں اس کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔

13.7 فرہنگ

(الفاظ)	:	(معانی)
ورشہ	:	میراث، ترکہ
سند	:	ثبوت، دلیل، صداقت نامہ
فارغ البالی	:	خوش حالی، آسودگی
آفتاب النہار	:	سورج
تمثل	:	کسی واقعہ کا مثالی انداز میں بیان

ملا وجہی: حیات، ادبی کارنامے اور قطب مشتری کا جائزہ	رزمیوں	:	وہ قصے جن میں جنگ کے واقعات بیان کیے جائیں، جنگ سے متعلق کہانیاں
	جان فشانی	:	سخت محنت، انتہائی کوشش
	طربیہ	:	وہ تحریر جس سے دل میں طرب کا احساس پیدا ہو
	ما فوق الفطرت	:	جو فطری قوتوں سے بالاتر قوتوں کا نتیجہ ہو اور علت و معلول کے قانون سے آزاد ہو
	عجیب الخلق	:	حیرت انگیز بناوٹ کا، انوکھی شکل کا
	حصار	:	گھیرا، حلقہ، بلا اور آسیب سے محفوظ رہنے کے لیے ایک طرح کا ٹوٹکا
	اسم اعظم	:	خدائے تعالیٰ کا سب سے بڑا نام
	توہمات	:	توہم کی جمع، وہم گمان، شک، شبہ، وہم میں پڑنا
	طلسماتی	:	طلسمات سے منسوب، جادوئی
	وقع	:	بلند مرتبے والا، ذی عزت، ذی وقار
	راکشس	:	دیو، شیطان
	ملعون	:	قابل لعنت، پھٹکارا ہوا
	ندرت	:	نیاپین، اچھوتا

13.8 کتب برائے مطالعہ

۱- حیات وجہی	:	م-ن-سعید
۲- قطب مشتری (مرتبہ)	:	مولوی عبدالحق
۳- ملا وجہی (مونوگراف)	:	ڈاکٹر جاوید وششٹ
۴- قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ	:	پروفیسر وہاب اشرفی
۵- اردو کی تین مثنویاں	:	پروفیسر خان رشید
۶- ملا وجہی اور انشائیہ (ایک تحقیقی مطالعہ)	:	ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی

اُردو کے نمائندہ مثنوی نگار اور متن
کی تدریس و تفہیم



ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 14 ندرتی: حیات، ادبی کارنامے اور ’علی نامہ‘ کا جائزہ

ساخت

14.1 اغراض و مقاصد

14.2 تمہید

14.3 ندرتی: حیات، ادبی کارنامے اور ’علی نامہ‘ کا جائزہ

14.3.1 ندرتی کے سوانحی احوال و کوائف

14.3.2 ندرتی کے ادبی کارنامے

14.3.3 ندرتی کی مثنوی ’علی نامہ‘ کا جائزہ

14.3.4 حاصل

14.4 آپ نے کیا سیکھا؟

14.5 اپنا امتحان خود لیجیے

14.6 سوالوں کے جوابات

14.7 فرہنگ

14.8 کتب برائے مطالعہ

14.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- ندرتی کے سوانحی احوال و کوائف سے واقف ہوں گے۔
- ندرتی کے ادبی کارناموں کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔
- ندرتی کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے آگاہ ہوں گے۔
- ندرتی کی مشہور مثنوی ’علی نامہ‘ سے بحث کریں گے۔
- ندرتی کی مشہور مثنوی ’علی نامہ‘ کے تجزیے کے ذریعے اس کی انفرادیت کو سمجھیں گے۔

14.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائی میں آپ اردو کے نمائندہ مثنوی نگار شاعر ملاو جہی کے سوانحی احوال و کوائف، ادبی

کارناموں سے واقف ہوئے۔ آپ نے ان کی مشہور مثنوی 'قطب مشتری' کے تجزیے کے ذریعے ان کی مثنوی نگاری کی فنی انفرادیت کو بھی سمجھا۔ اب اس اکائی میں آپ اردو کے ممتاز مثنوی نگار شاعر نصرتی کے سوانحی احوال و کوائف، ادبی کارناموں، ان کی معروف مثنوی 'علی نامہ' کے تجزیے سے واقف ہوں گے اور ان کی مثنوی نگاری کی فنی انفرادیت کو سمجھیں گے۔

3. 14 نصرتی: حیات، ادبی کارنامے اور 'علی نامہ' کا جائزہ

14.3.1 نصرتی کے سوانحی احوال و کوائف

نصرتی کے حالات زندگی اور ان کی شخصیت سے متعلق بہت زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ 'محبوب الزمن تذکرہ شعراء دکن' میں ان کا نام 'محمد نصرت' درج ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے نام کی مناسبت سے اسے قرین قیاس کہا ہے لیکن یقینی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ان کا نام 'محمد نصرت' ہی تھا۔ گارساں دتاسی نے نصرتی کو برہمن خاندان کا چشم و چراغ بتایا ہے جب کہ مولوی عبدالحق نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ کئی نسلوں سے مسلمان اور اسلامی تعلیمات کے ماننے والے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیسودراز کی مدح میں کہے گئے ان کے اس شعر سے ان کے مسلمان ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

بمجد اللہ کرسی بہ کرسی مری
چلی آئی ہے بندگی میں تری

نصرتی کے آبا و اجداد کے بارے میں بھی وافر معلومات موجود نہیں ہیں۔ البتہ نصرتی نے اپنی مثنوی 'دگشن عشق' میں اپنے آبا کے بارے میں جو اشعار نظم کیے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے آبا و اجداد پیشہ ورسپاہی تھے۔ وہ اصلاً دکن کے باشندے نہ تھے بلکہ یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ شاعری نصرتی کا موروثی پیشہ نہ تھا بلکہ وہ اپنے خاندان کے پہلے شاعر تھے۔ اس کا ثبوت ان کے درج ذیل شعر سے ملتا ہے جو 'علی نامہ' میں موجود ہے۔

اے شاہ رتن کا کھن ہوا مجھ من سو تیرا فیض ہے
کچھ کسب موروثی نہ ہوئی تھا کہ مجھ یو شاعری

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ نصرتی کے بارے میں تذکروں میں بہت زیادہ معلومات نہیں ملتی ہیں لیکن انھوں نے اپنی مثنویوں میں اپنے بارے میں جو اشعار کہے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بچپن سے شاہی گھرانے سے وابستہ رہے۔ علی عادل شاہ ثانی شاہی انھیں کم عمری سے ہی پسند کرتے تھے۔ شاہی محل میں ہی ان کی پرورش ہوئی اور ولی عہد عادل شاہ ثانی شاہی کے ساتھ ہی وہ دربار میں پروان چڑھے۔ شاہی کے عہد کی نام ور شخصیات میں سے قاضی سید کریم اللہ، شاہ ابوالمعالی اور شاہ نور اللہ وغیرہ ان کے خاص احباب تھے۔ نصرتی کی ابتدائی تعلیم و تربیت پران کے والد نے خصوصی توجہ دی تھی۔ یہی وجہ ہے علوم متداولہ اور مروجہ علوم انھیں بہترین اساتذہ سے حاصل کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ محمد ابراہیم صاحب بیجاپوری نے 'روضۃ الاولیاء' میں شیخ نصرتی کے بھائی شیخ منصور کے حالات کے ضمن میں جو باتیں تحریر کی ہیں، اس سے نصرتی کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

”آپ کے دو برادر مولانا شیخ ملا نصرتی ملک الشعراء اور شیخ عبدالرحمن سپاہی تھے۔ یہ ہر سہ برادران حقیقی ہیں۔ ہر ایک صاحب ایک ایک فن میں کمال رکھتے تھے۔ شیخ منصور علم دعوت میں شیخ عبدالرحمن سپاہ گری میں اور شیخ ملا نصرتی شاعری میں۔ مولانا شیخ منصور اور شیخ عبدالرحمن دونوں کو اولاد صلیبی نہیں ہے۔ مولانا شیخ ملا نصرتی ملک الشعراء کو آل ہے، اولاد نہیں اور ان کی آل سے پانچ چادر والے، گھڑیال والے، منور والے، ہاشم پیر والے، گول سنگی والے، نگینہ باغ والے، ہم ساگر والے موجود ہیں۔“

(مولوی عبدالحق، نصرتی، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۸۸ء، ص: ۱۲-۱۳)

مولوی عبدالحق کے مطابق نصرتی کی اولاد اب تک موجود ہے۔ ان کی اولاد زینہ میں کوئی نہیں تھا البتہ ایک بیٹی تھی اور 'روضۃ الاولیاء' کے مطابق اس کی اولاد سے ہی جعفر صاحب اور صاحب حسنی نگینہ باغ والے گول سنگی میں موجود ہیں۔ 'دعویٰ نامہ' کے چند اشعار اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ نصرتی کے دونوں بھائی ان کی حیات میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ نصرتی کی تاریخ وفات کے سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے تاہم ڈاکٹر جمیل جالبی نے دیگر تاریخوں کا تقابل کرنے کے بعد کہا ہے کہ نصرتی کا سال وفات ۱۰۸۵ھ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ نصرتی کی قبر بیجاپور کے نگینہ باغ میں ہے۔ مولوی عبدالحق کے مطابق یہ زمین اب گورنمنٹ ہائی اسکول کے احاطے میں ہے۔ نصرتی نے عادل شاہی سلطنت کے تین بادشاہوں؛ محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی شاہی اور سکندر عادل شاہ کا دور حکومت دیکھا تھا۔ بہ طور شاعر وہ محمد عادل شاہ کے دور حکومت میں ہی وجود پا چکے تھے۔ ان کا 'قصیدہ چرخہ' اسی دور کی یادگار ہے جس کی فنی خوبیوں اور کلام کی روانی و شیرینی کو ناقدین فن نے خوب سراہا ہے لیکن ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا جلوہ علی عادل شاہ ثانی شاہی کے دور میں زیادہ نمایاں ہوا۔ شاہی بچپن سے نصرتی کو عزیز رکھتے تھے۔ علی عادل شاہ سے ان کی قربت اور محبت کا اظہار ان کی بہت سی تخلیقات میں ہوا ہے۔ جب وہ بادشاہ بنے تو نصرتی بھی دربار شاہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

بلا بھیج بندے کو اس حال میں
نظر کر مرے بے بہا مال میں
پرکھتا چلیا یو رتن سر بسر
تھکے دیکھ پارکھ یو اہل نظر
وہیں جگ میں بندہ رہنے بے نیاز
رکھیا اپنی خدمت میں کر سرفراز

نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب 'دکن میں اردو' میں لکھا ہے کہ 'علی عادل شاہ ثانی شاہی نہ صرف مرہٹوں اور مرہٹوں کا سرپرست تھا

بلکہ نصرتی نے اس کی شاگردی بھی کی ہے۔ اس کا اظہار نصرتی نے اپنی مثنوی 'گلشن عشق' میں بھی کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ 'اسے نصرتی کی شاہی عقیدت مندی یا انکسار پر محمول کرنا چاہیے ورنہ وہ کسی کا شاگرد نہ تھا اور فطرتاً شاعر تھا'۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

مجھے یو سخن بادشاہ یاد ہے
پچھے پیر کے وصف استا ہے
مج استاد 'استاد عالم' اچھے
جتا علم از بر جسے جسم اچھے
بمجد اللہ یہ کیا بڑے بخت آج
نہ استاد کوئی مج علی شہ کے باج

نصرتی علی عادل شاہ ثانی شاہی کے شاگرد رہے ہوں یا نہ رہے ہوں لیکن یہ سچ ہے کہ ان کی قربت اور توجہ نے نصرتی کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشی اور انھیں وہ ماحول فراہم کیا جس میں وہ بے فکری کے ساتھ تخلیقی کام انجام دے سکے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی مشہور مثنویاں 'گلشن عشق' اور 'علی نامہ' اسی دور کی یادگار تصانیف ہیں۔ علی عادل شاہ ثانی شاہی نے ہی انھیں ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا۔ شاہی کے بیٹے سکندر عادل شاہ کے دور میں نصرتی نے 'تاریخ اسکندری' قلم بند کی تھی۔ مولوی عبدالحق نے 'تذکرہ ریاض حسنی' کے حوالے سے لکھا ہے:

”جب شاہ اورنگ زیب عالمگیر نے دکن فتح کیا تو وہاں کے شعرا کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ ان میں نصرتی بھی تھے اور ان کے کلام کو سب سے افضل تسلیم کیا اور خطاب 'ملک الشعراء' ہند سے سرفراز فرمایا۔“
(مولوی عبدالحق، نصرتی، ص: ۱۸)

14.3.2 نصرتی کے ادبی کارنامے

دکن کے جن شعرا کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی، ان میں ایک اہم نام نصرتی کا ہے۔ وہ عادل شاہی دور کے بلند پایہ اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ انھوں نے مثنوی، قصیدہ، غزل اور رباعی سبھی اصناف میں طبع آزمائی کی اور کئی اہم تخلیقات سے اردو ادب کا دامن بھر دیا۔ اردو شاعری خصوصاً اردو مثنوی کی تاریخ میں ان کا نام سنہری حروف سے لکھا جاتا ہے۔ 'گلشن عشق'، 'علی نامہ' اور 'تاریخ اسکندری' ان کی یادگار مثنویاں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا شعری کلام بھی یادگار ہے جس میں قصائد و غزلیات اور دیگر اصناف سخن موجود ہیں۔

'گلشن عشق' نصرتی کی ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ اس کا شمار اردو کی چند بڑی مثنویوں میں ہوتا ہے۔ نصرتی کی یہ مثنوی ان کے ادبی قد کا شناخت نامہ ہے۔ اس مثنوی کے مرکزی قصے کی بنیاد قدیم لوک کہانی 'کنور منور اور مدھو مالتی'

کی داستان عشق پر ہے۔ یہ داستان قدیم زبانی بیانیہ کا حصہ رہی ہے۔ فارسی میں بھی اس قصے کو کئی مصنفوں نے نظم کیا ہے۔ نصرتی نے اپنی مثنوی میں اس قصے کو نظم کر کے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ نصرتی کی اس مثنوی کا ہندوستانی رنگ و آہنگ اپنی جانب کھینچتا ہے۔ پوری مثنوی میں مقامیت جھلکتی نظر آتی ہے۔ اس میں تمام تر واقعات پر ہندو دیومالائی فضا کا غلبہ نظر آتا ہے۔ جادو ٹونے کے زور کا دکھائی دینا، راون کے دس سر، مہادیو کے چار ہاتھ، درگا کے دس ہاتھ، سرسوتی کے چار ہاتھ جیسی روایتوں کے عکس کا نظر آنا اور دوسرے روپ میں جنم لینے کی ہندوستانی روایت کا ذکر ملنا، یہ سب ہندو دیومالائی فضا کے اثرات ہیں۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ نصرتی نے بہادری کی مثال پیش کرنے کے لیے کسی اسلامی روایت سے وابستہ ہستی کا نام نہیں لیا ہے بلکہ اس کے لیے بھیم کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے گل و بلبل اور شمع و پروانے کی لفظیات سے زیادہ کوئل کی کوک اور پیسے کی ہوک میں دل چسپی ظاہر کی ہے۔ مدھ مالتی کے حسن کی تصویر کشی کے لیے کنول، چمپا کلی، بھونرے، ہاتھی اور نرس جیسے پھولوں اور جان داروں کے مخصوص اجزا و اعضاء کا سہارا لیا ہے جن کا ہندوستان سے راست تعلق ہے۔

مثنوی 'گلشن عشق' کا موضوع محبوب کی تلاش ہے لیکن اس تلاش کے سفر میں ایک پراسرار اور بھید بھری دنیا خلق ہوتی ہے۔ راجا فقیر کی تلاش میں جنگل جنگل بھٹکتا ہے۔ پریاں راجا کا درد جانتی ہیں۔ اسے فقیر کا پتہ بتاتے ہوئے اپنے سر کا بال دیتی ہیں جو مصیبت میں کام آئے اور اپنے تخت پر بٹھا کر اسے فقیر کے غارتک چھوڑتی ہیں۔ پریوں کا بال دکھانے پر فقیر راجا کو پاس بلاتا ہے اور شریفی کے درخت سے پھل توڑ کر رانی کو کھلانے کا مشورہ دیتا ہے۔ وہ پھل کھا کر رانی حاملہ ہو جاتی ہے۔ یہاں نجومی کا کردار اور اس کی پیش گوئیاں سامنے آتی ہیں۔ یہ سب کچھ مافوق فطرت مظہر و قوت سے تعلق رکھتے ہیں۔ چھت پر سوائے ہوئے راج کمار کے حسن سے پریوں کا متاثر ہونا اور اس کے لیے نو پریوں کا خوب صورت لڑکی کی تلاش میں نکلنا، پریوں کا راج کمار کا پلنگ اٹھانا اور اسے مدھ مالتی کے پلنگ کے پاس رکھ دینا یا پھر راج کمار کی آنکھوں میں پریوں کا سلائی ڈال دینا تاکہ وہ کسی کو نظر نہ آئے، یہ سب کچھ مافوق فطری عناصر سے تعلق رکھتے ہیں۔

'گلشن عشق' کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں انسانی جذبات کی پرچھائیں جاہ جارقص کرتی ہوئی نظر آتی ہیں اور قدرتی مناظر کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ حمد، مناجات، نعت، خواجہ بندہ نواز کی تعریف و توصیف، علی عادل شاہ کی مدح و ستائش، عقل کی تعریف، حال کا بیان، عشق کی مدح، فقیر کی تصویر کشی، باغ کا منظر نامہ، طلوع آفتاب اور صبح کے مناظر کی مرتع کشی، چاندنی کی دل کش کیفیت اور اس کے حسن کا بیان، ہجر و فراق کی کیفیت، موسم سرما، برف باری، مسافرت کے ماحول کی منظر کشی، تمازت اور دھوپ کا بیان اور باغ کے بہار کی تصویر، یہ سب کچھ اس مثنوی میں موجود ہے۔ اس مثنوی کو پڑھ کر نصرتی کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔

نصرتی کی دوسری اہم ترین مثنوی 'دعویٰ نامہ' ہے۔ اس مثنوی کے تعلق سے تفصیلی بات آئندہ صفحات میں ہوگی۔ نصرتی کی تیسری مثنوی 'تاریخ اسکندری' ہے۔ اس کا اصل نام 'فتح نامہ بہلول خاں' ہے جس کی تکمیل ۱۰۸۲ھ مطابق ۱۶۷۳ء میں ہوئی۔ نصرتی نے یہ مثنوی علی عادل شاہ کی وفات کے بعد لکھی جو عہد سکندر عادل شاہ کی تاریخ

ہے۔ یہ نصرتی کے اس دور کا کلام ہے جب بیجاپور کی سلطنت انحطاط کا شکار تھی۔ اس میں انھوں نے اس وقت کے بیجاپور میں نفاق و مخالفت کی گرم بازاری کی تصویر پیش کی ہے۔ یہ ایک مختصر رزمیہ مثنوی ہے۔ اس میں صرف ۵۵۴ اشعار ہیں۔ اس کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فکرو فن کے اعتبار سے اس میں وہ زور اور شگفتگی نہیں پائی جاتی جو علی نامہ اور 'گلشن عشق' میں نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نصرتی کی اس مثنوی کو وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جو ان کی دوسری مثنویوں کو حاصل ہوئی۔

ایک ممتاز مثنوی نگار ہونے کے ساتھ ساتھ محمد نصرت نصرتی کا شمار قادر الکلام غزل گو شعرا میں بھی ہوتا ہے۔ ان کی غزل کا موضوع عورت ہے جس سے وہ ہم کلام ہوتے ہیں اور اپنے عشقیہ جذبات و احساسات کو بیان کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ریختی کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ مثنوی اور غزل کے علاوہ ان کے دیوان میں رباعیات و قصائد بھی ملتے ہیں۔ بعض ماہرین کے مطابق نصرتی نے نو قصیدے تحریر کیے ہیں جب کہ پروفیسر محمود الہی کے مطابق نصرتی نے کل بارہ قصیدے تحریر کیے ہیں۔ مثنوی 'علی نامہ' میں ہی سات قصائد شامل ہیں۔ نصرتی نے اپنے سلطان علی عادل شاہ کی مدح میں علاحدہ ایک قصیدہ تحریر کیا ہے۔ ان کا قصیدہ 'پنالہ گڑھ' ۱۱۵۵ اشعار پر مشتمل ہے جس کا آغاز علی عادل شاہ ثانی کی مدح سے ہوتا ہے۔ اس قصیدے میں گریز کے شعر کے بعد نصرتی نے شیواجی کی مذمت میں اشعار کہے ہیں جو قلعہ پنالہ کی جنگ میں بادشاہ کا حریف تھا۔ قصیدہ 'فتح ملناز' کا آغاز بھی بادشاہ کی مدح کے ساتھ ہوا ہے۔ یہ قصیدہ ۱۲۲۰ بیات پر مشتمل ہے۔ اس قصیدے کو نصرتی نے 'بے بدل' قصیدہ قرار دیا ہے۔

سنو یک فتح کا شہہ کے قصیدہ بے بدل یارو

کہ ہر یک مختصر مضمون دھرے معنی مطول کا

اس قصیدے میں نصرتی نے ایک بہاریہ مطلع کہنے کے بعد باغ کی آرائش و تزئین کے بارے میں ۲۹ اشعار کہے ہیں۔ خوب صورت تشبیہات اور صنائع و بدائع کا استعمال اس قصیدے کی جان ہے۔ حالات جنگ، دشمنوں کی ہار، فتح شاہ اور جشن فتح کی مکمل منظر کشی اس قصیدے میں ملتی ہے۔ معراج کے بیان میں ایک طویل قصیدہ ان کی یادگار ہے۔ اس قصیدے کے آخر میں انھوں نے محمد عادل شاہ کی مدح و ستائش میں بھی اشعار قلم بند کیے ہیں۔ ان کا ایک قصیدہ 'عاشورہ کے بیان میں' ہے۔ اس قصیدے میں تشبیب کے اشعار کے بعد حمد، نعت اور منقبت کے اشعار ہیں۔ شہادت کا ذکر بھی اس قصیدے کا حصہ ہے۔ تشبیہات و استعارات کے حسین استعمال اور حسن بیان نے اس قصیدے کو عظیم بنا دیا ہے۔ ان کا قصیدہ 'فتح بادشاہ غازی' ۵۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کے دیگر قصیدوں میں 'بادشاہ غازی بیجاپور کو آنے کا' اور 'قصیدہ فصل زمستان' کا ذکر ملتا ہے۔ نصرتی نے مدحیہ قصیدوں کے ساتھ ساتھ ہجو یہ قصائد بھی تحریر کیے ہیں۔ ایک گھوڑے کی مذمت میں لکھا ہوا ان کا قصیدہ قابل ذکر ہے۔ ناقدین فن نے لکھا ہے کہ ان کی مثنوی میں مختلف عنوانات کے ذیل میں درج اشعار کو اگر ایک جگہ مرتب کر دیا جائے تو ایک بہترین قصیدہ تیار ہو جائے گا۔ نصرتی نے موسم سرما یا ٹھنڈے پر بھی قصیدہ تحریر کیا ہے جسے بقول پروفیسر محمود الہی 'سعدی

کے بہاریہ قصیدوں کے مقابلے میں رکھا جاسکتا ہے۔ ان کا ایک نعتیہ قصیدہ معراج نبوی کے بیان میں ہے۔ معراج اسلامی تاریخ کا ایک بڑا واقعہ ہے اور اردو شاعری میں اس واقعہ کا اس قدر مکمل اور تفصیلی بیان اس قصیدے کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتا۔ اس قصیدے کے تمہیدی اشعار کا تعلق بھی فلکیات سے ہے۔ نصرتی کے اس قصیدے کو ناقدین نے چرخیات میں شمار کیا ہے۔ دکن میں زیادہ طویل قصیدوں کی روایت نہیں ملتی البتہ دعویٰ نامہ میں مذکور کئی قصائد قدرے طویل ہیں جن میں سو سے زائد اشعار ملتے ہیں۔

نصرتی کے قصیدوں میں صنف قصیدہ کی تمام اہم خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ شوکتِ لفظی اور زور بیان ان کے قصائد کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کی زیادہ توجہ مدح پر ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں تشبیب کے اشعار بہت مختصر ہوتے ہیں۔ وہ بھی قلی قطب شاہ کی طرح قصیدے کے اجزائے ترکیبی میں ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ عموماً ان کے قصیدے مدح سے شروع ہوتے ہیں جیسے فتح پنالہ والے معرکہ الآرا قصیدے کے آغاز میں ہی وہ بادشاہ کی تلوار کی تعریف کرتے ہیں۔

نصرتی کو دکن کا سب سے اہم قصیدہ نگار مانا جاتا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب 'دکن میں اردو میں نصرتی کے قصیدوں کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

”نصرتی کے قصائد اپنے تسلسل بیان، واقعہ نگاری اور شوکتِ لفظی کے لحاظ سے قابل تعریف ہیں اور پھر خیالات کی جدت اور تشبیہ اور استعارات کی ندرت، تخیل کی بلند پروازی زور بیان سے بھی خالی نہیں۔“
(نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، قومی کونسل برائے

فروع اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص: ۲۱۵)

نصرتی کے قصائد میں واقعہ نگاری، منظر نگاری اور رزمیہ شاعری کا پہلو انتہائی متاثر کن ہے۔ اکثر ماہرین ادب نے نصرتی کے قصائد کی اہمیت و انفرادیت سے بحث کرتے ہوئے اسے اردو کے قدیم اور دکن کا سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر قرار دیا ہے۔ بادشاہ کی تلوار کی تعریف میں ان کا یہ شعر دیکھیے:

جب تے جھلک دیکھا اوک سورج تری تر وار کا
تب تے لکیا تھر کا پنپے ہو پُر عرق یکبار کا

دکنی قصیدوں میں مذہبی موضوعات بہ کثرت ملتے ہیں۔ زیادہ تر مذہبی موضوعات کا تعلق حمد، نعت یا منقبت سے رہا ہے۔ نصرتی نے بھی نے ایک قصیدہ مجلس عاشورہ سے متعلق تحریر کیا ہے جس میں رثائی عنصر موجود ہے۔ اس لیے موضوعاتی سطح پر اس قصیدے کو مرثیہ کہا جاسکتا ہے۔ دکنی قصیدوں میں مدحیہ اشعار تو بہ کثرت ملتے ہیں تاہم رثائیہ قصیدے نہیں ملتے۔ حالاں کہ عربی و فارسی میں اس طرح کے قصائد موجود ہیں۔ نصرتی نے ابتدائی دور میں ہی اس کمی کو پورا کر دیا تھا۔ نصرتی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ہجو یہ قصیدہ بھی تحریر کیا ہے۔ اپنے ہجو یہ قصیدے میں انہوں نے اپنی شاعرانہ عظمت کا فخر یہ بیان کیا ہے جب کہ اپنے مخالفین کو آڑے

ہاتھوں لیتے ہوئے انھیں ہرزہ گویاں، خام پٹلاں، خنثی، غبی، خر، منافق، پتھر، کتیا، کورطبعان اور کم ذات جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

نصرتی کے قصائد کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے قصائد میں ربط و تسلسل، مقامیت، ارضیت، پرشکوہ بیان، عمدہ اور سلیس زبان، جوش بیان، دلکش تشبیہات و استعارات، تلمیحات و اساطیر، عربی و فارسی لفظوں کا بر محل استعمال، رزمیہ عناصر، منظر کشی، واقعات نگاری اور تاریخی حقیقت نگاری جیسی خوبیاں موجود ہیں۔ ان کے قصیدوں کی ان ہی خوبیوں کے سبب انھیں دکن کا سب سے بلند پایہ قصیدہ گو شاعر قرار دیا گیا ہے۔ بعض ماہرین ادب نے یہ حیثیت قصیدہ نگاران کو سودا اور ذوق کی صف میں کھڑا کیا ہے۔

14.3.3 نصرتی کی مثنوی 'علی نامہ' کا جائزہ

نصرتی کی مثنوی 'علی نامہ' اردو کی اہم ترین رزمیہ مثنوی ہے جو ۱۰۷۶ھ میں منظر عام پر آئی۔ اسے نصرتی کا شاہ کار بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں علی عادل شاہ کی جنگی مہمات کا ذکر تفصیل سے موجود ہے جو جنگ انھوں نے مراٹھوں، حبشی سرداروں اور مغلوں کی فوج سے لڑی تھی۔ علی عادل شاہ جب تخت نشین ہوئے تو ان کی عمر محض ۱۸ سال تھی مگر انھوں نے بیک وقت سلطنت کے بدخواہ اور منافق امرا کی سازشوں اور کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے باہری طاقتوں کی محاذ آرائی کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کم سنی کے باوجود اپنی ہمت و حوصلے سے وہ اپنی سلطنت کو ان سبھی مشکلات سے نکلنے میں کامیاب رہے۔ نصرتی نے ان تمام تر تفصیلات کو 'علی نامہ' میں محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ اردو کی ایک اہم رزمیہ مثنوی ہے۔ اردو میں رزمیہ یا تاریخی و سوانحی مثنویاں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ دکن کے بہت سے شاعروں سے رزمیہ مثنویاں منسوب ضرور ہیں تاہم کوئی بھی مثنوی کسی بڑے رزمیہ موضوع کو سمیٹے ہوئے نظر نہیں آتی۔ شعرا کے دربار سے انسلاک کے سبب چھوٹے چھوٹے واقعات کی عکس بندی ضرور ہو جاتی تھی۔ ساتھ ہی بعض اوقات بادشاہ وقت کی فرمائش پر کسی جنگ کے احوال ضرور رقم ہو جاتے تھے لیکن جو بھی مثنویاں رزمیہ موضوعات پر ملتی ہیں، ان میں نصرتی کی مثنوی 'علی نامہ' سرفہرست ہے۔ اس مثنوی میں بیجا پور پر مغلوں اور شیواجی کی قیادت والے مرہٹوں کی رسہ کشی کی داستان، بادشاہ وقت علی عادل شاہ کی میدان جنگ میں بذات خود آمد، فوجی قیادت، راجہ بدنور کی سرکوبی اور مغل فوجی سربراہ بے سنگھ کو پسپا کرنے کی مہمات کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے 'علی نامہ' کو عہد بیجا پور کی ایک مستند تاریخ قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق نصرتی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب اور بڑی احتیاط کے ساتھ برتا ہے۔ مثنوی کا ہیرو علی عادل شاہ ثانی شاہی ہے جو شجاعت اور بہادری میں بے نظیر تھا۔ نصرتی نے اس جنگ کو بہت قریب سے دیکھا تھا جس کا ثبوت 'علی نامہ' میں منظوم جنگی مناظر، فتح و کام رانی کی سرشاری، شکست و ریخت سے دوچار فوجیوں کی پریشانی، بادشاہ کی انصاف پسندی، فیاضی و سخاوت اور رعایا پروری سے متعلق بیانات سے ملتا ہے۔ یہ مثنوی اردو زبان کی شاہ کار مثنوی تسلیم کی جاتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس مثنوی پر مبسوط تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

”نصرتی کا بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب، بڑی احتیاط

نصرتی: حیات، ادبی کارنامے اور
دعلی نامہ کا جائزہ

اور صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ حسن بیان اور زور کلام کے تمام اسلوب ہوتے ہوئے کہیں تاریخی صحت سے تجاوز نہیں کیا۔ تاریخ سے واقعات کو ملا لیجئے کہیں فرق نہ پائیے گا بلکہ بعض باتیں شاید ایسی ملیں گی جن کے بیان سے تاریخ قاصر ہے۔ باوجود اس کے واقعات کی تفصیل، مناظر قدرت کی کیفیت، رزم و بزم کی داستان اور جنگ کا نقشہ کمال فصاحت و بلاغت اور صناعتی سے کھینچا ہے۔ اردو زبان یوں ہی رزمیہ نظموں سے خالی ہے اور ایک آدھ رزمیہ نظم جو اس سے قبل لکھی گئی ہے، وہ ہرگز اس کو نہیں پہنچتی۔ یہ رزمیہ مثنوی ہر لحاظ سے ہماری زبان میں بے نظیر ہے۔“

(مولوی عبدالحق، نصرتی، ص: ۷۶)

نصرتی نے اس مثنوی میں حمد، مناجات، نعت اور پھر سلطان کی مدح پیش کی ہے جو روایتی مثنویوں کا طریقہ رہا ہے۔ انھوں نے حمد یہ اشعار کو موضوع کی مناسبت سے رزمیہ رنگ میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے اللہ کے نظام عدل اور اس کی طاقت و قدرت کا بیان حمد یہ اشعار سے شروع کرتے ہوئے کہا ہے کہ تلوار کے بغیر امن و صلح نہیں ہو سکتی اور خدا نے جس کو بھی عظمت و بلندی عطا کی ہے، اسے اس کے تحفظ کے لیے ہتھیار سے بھی نوازا ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل اشعار دیکھیے:

لو ہے کوں کیا توں سفر کا رفیق
لوہا نیں تو زر دشمن ہر طریق
لو ہے بن نکوی یا جانی ہے ہو
لو ہے تھیج ہے یار جانی کوں زور

دعلی نامہ میں ہر باب کے عنوان کا آغاز ایک شعر سے ہوا ہے۔ اس شعر سے اس باب کے موضوعات و مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ چوں کہ عنوانات کے اشعار ایک ہی بحر اور قافیے میں ہیں، اس لیے بقول مولوی عبدالحق اگر انھیں ایک ساتھ جمع کر دیا جائے تو ایک لامیہ قصیدہ بن جائے گا۔ عنوان کے طور پر مذکور دو شعر ملاحظہ ہوں:

حمد اول ہے خدا کا کہ جنے روز ازل
دیا ہے ہمتِ مرداں کو جو توفیق سوں بل
رکھا اس نامہ نامی کا علی نامہ نانوں
تا جنم جگ یو زمانے کے گلے ہوئے ہیکل

نصرتی نے دعلی نامہ لکھنے کے اسباب اور اس کے اغراض و مقاصد پر بھی روشنی ڈالی ہے، ساتھ ہی اپنے کلام کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے اس پر فخر کا اظہار بھی کیا ہے۔ انھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ وہ جس زبان میں یہ کلام پیش کر رہے ہیں، ابھی اس کا عہد طفلی ہی چل رہا ہے لیکن انھیں فخر تھا کہ انھوں نے اس زبان کو کہاں

سے کہاں پہنچا دیا۔

مثنوی ’علی نامہ‘ میں علی عادل شاہ کی تخت نشینی کا جشن، جشن کے موقع پر شہر کی آرائش و سجاوٹ اور رعایا نیز درباریوں کی خوشی و مسرت کا بیان تفصیل سے کیا گیا ہے۔ نصرتی اپنے بادشاہ کی عقل مندی اور بہادری کی جگہ جگہ تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انھوں نے تخت نشینی کے بعد ابتدائی دنوں میں بھی حکومت کے خلاف ہونے والی اندرونی سازشوں اور بیرونی محاذوں سے نمٹنے میں کمال ہنر مندی اور بہادری کا ثبوت دیا ہے۔ اس ضمن میں کہے گئے ان کے چند اشعار دیکھیے:

اگن پن وہ فتنے کی چوندھیر سوں
اٹھی تھی وو شمشیر کے نیر سوں
اسے یک طرف تھے بجاویں تلگ
اٹھے بھی وہ دسرے رخن تھے سلگ
بزرگی جسے ات خداداد ہے
دل اس کا نبر پین میں پولاد ہے

’علی نامہ‘ کا مدحیہ حصہ بہت اہم ہے۔ مغلوں کے ساتھ علی عادل شاہ کو کبھی کام یابی اور کبھی ناکامی ہاتھ لگی تھی مگر نصرتی نے ہر لڑائی میں اپنے محبوب بادشاہ کو فاتح ہی قرار دیا ہے۔ پوری مثنوی میں بادشاہ کی بہادری کے قصوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ چون کہ نصرتی خود ایک سپاہی تھے اور بادشاہ وقت سے قریبی تعلق کے سبب انھوں نے ان جنگوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا، اسی لیے انھوں نے جنگ سے متعلق معمولی معمولی تفصیلات کی بھی منظر کشی یعنی شاہد کی طرح کی ہے۔ ’علی نامہ‘ میں نصرتی کی واقعہ نگاری، جزئیات نگاری اور تشبیہات و استعارات کا استعمال قابل تعریف ہے۔ مولوی عبدالحق نے جنگ کی تیاری، بہادریوں کی نبرد آزمانی، گھوڑوں کی بادہ پیمائی، ہتھیاروں کے چلنے اور جنگ کے دیگر مناظر کی منظر کشی میں نصرتی کے کمال فن کا اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ ضمیر اور انیس سے پہلے نصرتی کے علاوہ کسی اور نے اس درجہ کی رزمیہ شاعری نہیں کی ہے۔

14.3.4 حاصل

دکن کے جن شعرا کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی، ان میں ایک اہم نام نصرتی کا ہے۔ ان کے حالات زندگی اور ان کی شخصیت سے متعلق بہت زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ محققین کے مطابق ان کا نام ’محمد نصرت‘ ہے۔ وہ بچپن سے شاہی گھرانے سے وابستہ رہے۔ علی عادل شاہ ثانی شاہی انھیں کم عمری سے ہی پسند کرتے تھے۔ شاہی محل میں ہی ان کی پرورش ہوئی اور ولی عہد عادل شاہ ثانی شاہی کے ساتھ ہی وہ دربار میں پروان چڑھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت پران کے والد نے خصوصی توجہ دی تھی۔ یہی وجہ ہے علوم متداولہ اور مروجہ علوم انھیں بہترین اساتذہ سے حاصل کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ ان کو کوئی اولاد نہ رہی تھی البتہ ایک بیٹی تھی۔ ان کی تاریخ وفات کے سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے تاہم ڈاکٹر جمیل جالبی نے دیگر تاریخوں کا تقابل کرنے کے بعد کہا ہے کہ

نصرتی کا سال وفات ۱۰۸۵ھ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ان کی قبر بیجاپور کے نکینہ باغ میں ہے۔

نصرتی عادل شاہی دور کے بلند پایہ اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ انھوں نے مثنوی، قصیدہ، غزل اور رباعی سبھی اصناف میں طبع آزمائی کی اور کئی اہم تخلیقات سے اردو ادب کا دامن بھر دیا۔ اردو شاعری خصوصاً اردو مثنوی کی تاریخ میں ان کا نام سنہری حروف سے لکھا جاتا ہے۔ ’گلشن عشق‘، ’دعویٰ نامہ‘ اور ’تاریخ اسکندری‘ ان کی یادگار مثنویاں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا شعری کلام بھی یادگار ہے جس میں قصائد و غزلیات اور دیگر اصناف سخن موجود ہیں۔ ان کی مثنوی ’دعویٰ نامہ‘ اردو کی اہم ترین رزمیہ مثنوی ہے جو ۱۶۷۰ء میں منظر عام پر آئی۔ اس مثنوی میں بیجاپور پر مغلوں اور شیواجی کی قیادت والے مرہٹوں کی رسسہ کشی کی داستان، بادشاہ وقت علی عادل شاہ کی میدان جنگ میں بذات خود آمد، فوجی قیادت، راجہ بدنور کی سرکوبی اور مغل فوجی سربراہ جے سنگھ کو پسپا کرنے کی مہمات کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔ مثنوی کا ہیرو علی عادل شاہ ثانی شاہی ہے جو شجاعت اور بہادری میں بے نظیر تھا۔ نصرتی نے اس جنگ کو بہت قریب سے دیکھا تھا جس کا ثبوت ’دعویٰ نامہ‘ میں منظوم جنگی مناظر، فتح و کامرانی کی سرشاری، شکست و ریخت سے دوچار فوجیوں کی پریشانی، بادشاہ کی انصاف پسندی، فیاضی و سخاوت اور رعایا پروری سے متعلق بیانات سے ملتا ہے۔ یہ مثنوی اردو زبان کی شاہ کار مثنوی تسلیم کی جاتی ہے۔ اس مثنوی کا مدیہ حصہ بہت اہم ہے۔ مغلوں کے ساتھ علی عادل شاہ کو کبھی کام یابی اور کبھی ناکامی ہاتھ لگی تھی مگر نصرتی نے ہر لڑائی میں اپنے محبوب بادشاہ کو فاتح ہی قرار دیا ہے۔ پوری مثنوی میں بادشاہ کی بہادری کے قصوں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ چون کہ نصرتی خود ایک سپاہی تھے اور بادشاہ وقت سے قریبی تعلق کے سبب انھوں نے ان جنگوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا، اسی لیے انھوں نے جنگ سے متعلق معمولی معمولی تفصیلات کی بھی منظر کشی عینی شاہد کی طرح کی ہے۔ ’دعویٰ نامہ‘ میں نصرتی کی واقعہ نگاری، جزئیات نگاری اور تشبیہات و استعارات کا استعمال قابل تعریف ہے۔ مولوی عبدالحق نے جنگ کی تیاری، بہادریوں کی نبرد آزمانی، گھوڑوں کی بادہ پیمائی، ہتھیاروں کے چلنے اور جنگ کے دیگر مناظر کی منظر کشی میں نصرتی کے کمال فن کا اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ ضمیر اور انیس سے پہلے نصرتی کے علاوہ کسی اور نے اس درجہ کی رزمیہ شاعری نہیں کی ہے۔

14.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- نصرتی کے سوانحی احوال و کوائف سے واقفیت حاصل کی۔
- نصرتی کے ادبی کارناموں کے بارے میں معلومات حاصل کی۔
- نصرتی کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے آگاہی حاصل کی۔
- نصرتی کی مشہور مثنوی ’دعویٰ نامہ‘ سے بحث کی۔

- نصرتی کی مشہور مثنوی 'علی نامہ' کے تجزیے کے ذریعے اس کی انفرادیت کو سمجھا۔

14.5 اپنا امتحان خود لیجیے

- ۱- نصرتی کے سوانحی احوال و کوائف پر مختصراً اظہار خیال کیجیے۔
- ۲- نصرتی اور علی عادل شاہ ثانی کے مابین تعلقات پر روشنی ڈالیے۔
- ۳- نصرتی نے کتنے قصیدے اور مثنویاں تحریر کی ہیں؟
- ۴- نصرتی کی مشہور مثنوی 'علی نامہ' کی اشاعت کب ہوئی اور اس کا موضوع کیا ہے؟
- ۵- نصرتی کی مشہور مثنوی 'علی نامہ' کی فنی خصوصیات و امتیازات سے مختصراً بحث کیجیے۔

14.6 سوالوں کے جوابات

- ۱- نصرتی کے حالات زندگی اور ان کی شخصیت سے متعلق بہت زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ محققین کے مطابق ان کا نام 'محمد نصرت' ہے۔ وہ بچپن سے شاہی گھرانے سے وابستہ رہے۔ علی عادل شاہ ثانی شاہی انھیں کم عمری سے ہی پسند کرتے تھے۔ شاہی محل میں ہی ان کی پرورش ہوئی اور ولی عہد عادل شاہ ثانی شاہی کے ساتھ ہی وہ دربار میں پروان چڑھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت پران کے والد نے خصوصی توجہ دی تھی۔ یہی وجہ ہے علوم متداولہ اور مرصعہ علوم انھیں بہترین اساتذہ سے حاصل کرنے کا موقع فراہم ہوا۔ ان کو کوئی اولاد زینہ نہیں تھی البتہ ایک بیٹی تھی۔ ان کی تاریخ وفات کے سلسلے میں اختلاف پایا جاتا ہے تاہم ڈاکٹر جمیل جالبی نے دیگر تاریخوں کا تقابل کرنے کے بعد کہا ہے کہ نصرتی کا سال وفات ۱۰۸۵ھ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ان کی قبر بیجا پور کے نگینہ باغ میں ہے۔
- ۲- نصرتی نے عادل شاہی سلطنت کے تین بادشاہوں؛ محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی شاہی اور سکندر عادل شاہ کا دور حکومت دیکھا تھا۔ بہ طور شاعر وہ محمد عادل شاہ کے دور حکومت میں ہی وجود پا چکے تھے۔ ان کا 'قصیدہ چرنیہ' اسی دور کی یادگار ہے جس کی فنی خوبیوں اور کلام کی روانی و شیرینی کو ناقدرین فن نے خوب سراہا ہے لیکن ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا جلوہ علی عادل شاہ ثانی شاہی کے دور میں زیادہ نمایاں ہوا۔ شاہی بچپن سے نصرتی کو عزیز رکھتے تھے۔ علی عادل شاہ سے ان کی قربت اور محبت کا اظہار ان کی بہت سی تخلیقات میں ہوا ہے۔ جب وہ بادشاہ بنے تو نصرتی بھی دربار شاہ تک پہنچنے میں کام یاب ہوئے۔ نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب 'دکن میں اردو' میں لکھا ہے کہ 'علی عادل شاہ شاہی نہ صرف مربی اور سرپرست تھا بلکہ نصرتی نے اس کی شاگردی بھی کی ہے۔' اس کا اظہار نصرتی نے اپنی مثنوی 'گلشن عشق' میں بھی کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ 'اسے نصرتی کی شاہی عقیدت مندی یا انکسار پر محمول کرنا چاہیے ورنہ وہ کسی کا شاگرد نہ تھا اور فطرتاً شاعر تھا۔'
- ۳- بعض محققین کے مطابق نصرتی نے نو قصیدے تحریر کیے ہیں جب کہ پروفیسر محمود الہی کے مطابق نصرتی

نے کل بارہ قصیدے تحریر کیے ہیں۔ ان کی مثنوی 'دعلی نامہ' میں ہی سات قصائد شامل ہیں۔ 'گلشن عشق'،
'دعلی نامہ' اور 'تاریخ اسکندری' ان کی تین یادگار مثنویاں ہیں۔

۴۔ نصرتی کی مشہور مثنوی 'دعلی نامہ' ۱۰۷۶ھ میں منظرِ عام پر آئی۔ اس میں بیجاپور پر مغلوں اور شیواجی کی
قیادت والے مرہٹوں کی رسہ کشی کی داستان، بادشاہ وقت علی عادل شاہ کی میدان جنگ میں بذات خود
آمد، فوجی قیادت، راجہ بدنور کی سرکوبی اور مغل فوجی سربراہ جے سنگھ کو پسپا کرنے کی مہمات کے کارنامے
بیان کیے گئے ہیں جو اس مثنوی کا موضوع ہیں۔

۵۔ نصرتی کی مشہور مثنوی 'دعلی نامہ' اردو کی اہم ترین رزمیہ مثنوی ہے جو ۱۰۷۶ھ میں منظرِ عام پر آئی۔ اسے
نصرتی کا شاہ کار بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں علی عادل شاہ کی جنگی مہمات کا ذکر تفصیل سے موجود ہے جو
جنگ انھوں نے مراٹھوں، جشی سرداروں اور مغلوں کی فوج سے لڑی تھی۔ علی عادل شاہ جب تخت نشین
ہوئے تو ان کی عمر محض ۱۸ سال تھی مگر انھوں نے بیک وقت سلطنت کے بدخواہ اور منافق امرا کی
سازشوں اور کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے باہری طاقتوں کی محاذ آرائی کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کم سنی کے
باوجود اپنی ہمت و حوصلے سے وہ اپنی سلطنت کو ان سبھی مشکلات سے نکالنے میں کامیاب رہے۔ نصرتی
نے ان تمام تر تفصیلات کو 'دعلی نامہ' میں بڑے ہی دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے 'دعلی
نامہ' کو عہدِ بیجاپور کی ایک مستند تاریخ قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق نصرتی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے
تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب اور بڑی احتیاط کے ساتھ برتا ہے۔ اس مثنوی کا مدحیہ حصہ بہت اہم ہے۔
مغلوں کے ساتھ علی عادل شاہ کو کبھی کامیابی اور کبھی ناکامی ہاتھ لگی تھی مگر نصرتی نے ہر لڑائی میں اپنے
محبوب بادشاہ کو فاتح ہی قرار دیا ہے۔ پوری مثنوی میں بادشاہ کی بہادری کے قصوں کو تفصیل سے بیان کیا
گیا ہے۔ چونکہ نصرتی خود ایک سپاہی تھے اور بادشاہ وقت سے قریبی تعلق کے سبب انھوں نے ان
جنگوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا، اسی لیے انھوں نے جنگ سے متعلق معمولی معمولی تفصیلات کی بھی
منظر کشی یعنی شاہد کی طرح کی ہے۔ 'دعلی نامہ' میں نصرتی کی واقعہ نگاری، جزئیات نگاری اور تشبیہات و
استعارات کا استعمال قابلِ تعریف ہے۔ مولوی عبدالحق نے جنگ کی تیاری، بہادری کی نبرد آزمائی،
گھوڑوں کی بادہ پیمائی، ہتھیاروں کے چلنے اور جنگ کے دیگر مناظر کی منظر کشی میں نصرتی کے کمال فن کا
اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ ضمیر اور انیس سے پہلے نصرتی کے علاوہ کسی اور نے اس درجہ کی رزمیہ شاعری
نہیں کی ہے۔

14.7 فرہنگ

(الفاظ)	(معنی)	:	پالنے، پرورش کرنے والا
مربی	:	افراط، کثیر	
وافر	:	افراط، کثیر	

بہادری	:	شجاعت
مروج علوم، وہ علوم جو عام طور سے اپنے عہد میں رائج ہوں	:	علوم متداولہ
گمان کیا گیا، قیاس کیا گیا،	:	محمول
فروتی، خاکساری، عاجزی	:	انکسار
خیالی کہانیاں، دیوتاؤں کے قصے	:	دیومالا
پوشیدہ، چھپا ہوا، نامعلوم، جس میں کچھ راز یا بھید ہو	:	پُراسرار
ستاروں کا علم رکھنے والا، جیوتشی،	:	نجومی
جنگ سے متعلق	:	رزمیہ
زوال، پستی، تنزل	:	انحطاط
بادل	:	ابھال
تھا	:	اتھا
اندھیرا	:	اندھاری
نصیحت	:	پند
فولاد	:	پولاد
جواہرات، قیمتی پتھر، نگ	:	رتن
لڑائی، مقابلہ، جنگ	:	نبرد آزمائی

14.8 کتب برائے مطالعہ

ڈاکٹر گیان چند جین	:	۱۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں
مولوی عبدالحق	:	۲۔ نصرتی
ڈاکٹر جمیل جالبی	:	۳۔ تاریخ ادبِ اردو
عبدالقادر سروری	:	۴۔ اردو مثنوی کا ارتقا
سید محمد عقیل رضوی	:	۵۔ اردو مثنوی کا ارتقا (شمالی ہند میں)
ڈاکٹر جمیل جالبی	:	۶۔ دیوان نصرتی (مرتبہ)

اکائی 15 ابن نشاٹمی: حیات، ادبی کارنامے اور پھول بن کا جائزہ

ساخت

15.1 اغراض و مقاصد

15.2 تمہید

15.3 ابن نشاٹمی: حیات، ادبی کارنامے اور پھول بن کا جائزہ

15.3.1 ابن نشاٹمی کے سوانحی احوال و کوائف اور ان کے ادبی کارنامے

15.3.2 ابن نشاٹمی کی مثنوی 'پھول بن' کا جائزہ

15.3.3 ابن نشاٹمی کی مثنوی 'پھول بن' کے ادبی محاسن

15.3.4 ماہصل

15.4 آپ نے کیا سیکھا؟

15.5 اپنا امتحان خود لیجیے

15.6 سوالوں کے جوابات

15.7 فرہنگ

15.8 کتب برائے مطالعہ

15.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ:

- ابن نشاٹمی کے سوانحی احوال و کوائف سے واقف ہوں گے۔
- ابن نشاٹمی کے ادبی کارناموں کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔
- ابن نشاٹمی کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے آگاہ ہوں گے۔ ابن نشاٹمی کی مثنوی 'پھول بن' سے بحث کریں گے۔
- ابن نشاٹمی کی مثنوی 'پھول بن' کے تجزیے کے ذریعے اس کی انفرادیت کو سمجھیں گے۔

15.2 تمہید

عزیز طلبا! پچھلی اکائی میں آپ اُردو کے نمائندہ مثنوی نگار نصرتی کے سوانحی احوال و کوائف اور ان کے ادبی کارناموں سے واقف ہوئے۔ آپ نے ان کی مشہور مثنوی 'علی نامہ' کے تجزیے کے ذریعے ان کی مثنوی نگاری کی فنی انفرادیت کو بھی سمجھا۔ اب اس اکائی میں آپ اُردو کے ممتاز مثنوی نگار ابن نشاٹمی کے سوانحی احوال و کوائف، ادبی کارناموں سے واقف ہوں گے، ان کی مشہور مثنوی 'پھول بن' سے بحث کریں گے اور اس کے

15.3 ابن نشاطی: حیات ادبی کارنامے اور پھول بن کا جائزہ

15.3.1 ابن نشاطی کے سوانحی احوال و کوائف اور ان کے ادبی کارنامے

ابن نشاطی کا شمار قطب شاہی عہد کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ ابن نشاطی کے حالات زندگی کے بارے میں بہت زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ مثنوی پھول بن میں موجود داخلی شہادتوں سے ابن نشاطی کے حالات زندگی کے متنوع پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ مثنوی پھول بن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ابن نشاطی کے نام سے معروف تھے لیکن جدید تحقیق کے مطابق ان کا نام شیخ حمد مظہر الدین اور والد کا نام شیخ فخر الدین ہے جو ایک اچھے شاعر تھے اور نشاطی تخلص کرتے تھے۔ اپنے والد کی نسبت سے ہی انھوں نے ابن نشاطی تخلص اختیار کیا۔ ابن نشاطی کے خاندان اور ان کی پیدائش کے متعلق بھی وافر معلومات نہیں ملتی ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے ان کی تاریخ پیدائش ۱۶۳۱ء تا ۱۶۳۵ء کے درمیان کے زمانے کو قرار دیا ہے۔ مثنوی پھول بن کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ انشا پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ گول کندہ کے بادشاہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار کے معزز عہدے دار بھی تھے اور ان کی تعلیم و تربیت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی۔ فارسی ادب اور شاعری کے علاوہ فن بلاغت اور خاص طور پر علم معانی و بدیع پر انھیں غیر معمولی مہارت تھی۔ مثنوی پھول بن ابن نشاطی کی شخصیت کے کئی پہلوؤں اور ان کے انداز فکر و نظر کے کئی گوشوں کو اجاگر کرتی ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنے معاصرین اور پیش روؤں کے برعکس شیخی کے بجائے عاجزی و انکساری سے کام لیتے ہیں، وہ اپنے حریفوں کو طنز کا نشانہ نہیں بناتے، وہ معاصرین کے بجائے پیش روؤں سے اپنے کلام کی داد چاہتے ہیں۔ وہ اپنے پیش روؤں میں فیروز محمود، خیالی اور حسن شوقی کے کمالات کے معترف تھے۔ دراصل ابن نشاطی نے ان ہی اساتذہ کرام کے اسلوب کی پیروی کی تھی۔ ان کو اندازہ تھا کہ ان کا تخلیقی اسلوب اگر کسی کے اسلوب سے ہم آہنگ ہے تو وہ ان کے پیش رو شعرا کا اسلوب ہے۔ اسی لیے انھوں نے ان کے نہ ہونے پر اظہار افسوس کیا ہے۔

ابن نشاطی سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے شاعر تھے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ خود باکمال شاعر تھے جو فارسی زبان میں عمدہ شعر کہتے تھے۔ انھیں موسیقی میں بھی کامل مہارت حاصل تھی۔ ان کے دربار سے وجہی، غواصی، ملک خوشنود اور جنیدی جیسے ممتاز شعرا وابستہ رہے۔ اُردو زبان و ادب کے فروغ کے اعتبار سے یہ زریں عہد رہا ہے۔ یہ وہ عہد تھا جس میں دربار اور دربار سے باہر دونوں جانب شعر و سخن کی محفلیں آراستہ تھیں اور ہر طرف شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ اس دور میں صنفِ غزل کو مرکزیت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ابن نشاطی نے مثنوی پھول بن میں مثنوی لکھنے کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر غزل نہیں کہی تو کوئی بات نہیں۔ انھوں

ابن نشاٹی: حیات، ادبی کارنامے
اور پھول بن کا جائزہ

نے دلیل دی ہے کہ آخر فردوسی اور نظامی نے کون سی غزلیں کہی ہیں؟ غزل کے برعکس نظم کی خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے کہ اگر ہنر کا رتبہ دیکھنا ہے تو شاہنامہ پڑھنا چاہیے۔

غزل کا مرتبہ گرچہ اول ہے و لے ہر بیت میرا ایک غزل ہے
غزل گرنیں کہے تو نہیں ہے خامی جو کچھ بولے سو ظاہر ہے نظامی
غزل میں طوس کے استاد کوں ایک ہنر از ما کو شہنامہ منے دیک

ابن نشاٹی نے مثنوی کے علاوہ دیگر شعری اصناف میں طبع آزمائی نہیں کی ہے۔ زمانے کے چلن کے مطابق انھوں نے غزلیں بھی نہیں کہیں سوائے ایک غزل کے جو پھول بن میں شامل ہے۔ بقول محمد اکبر الدین صدیقی:

”اس غزل کو پڑھ کر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر ابن نشاٹی اس ذوق کو ترقی دیتا تو وہ اس دور کے بہترین غزل گو شعرا میں ہو سکتا تھا۔“

(محمد اکبر الدین صدیقی (مرتبہ)، پھول بن، ابن نشاٹی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی،
۱۹۹۸ء، ص: ۲۲)

ابن نشاٹی کی سب سے مشہور مثنوی ’پھول بن‘ ہے۔ یہ مثنوی انھوں نے ۱۶۵۵ء میں صرف تین ماہ میں مکمل کی جو ۱۷۴۲ء پر مشتمل ہے۔ ابن نشاٹی کے مطابق اس کا ماخذ ایک فارسی قصہ ’ساتین الانس‘ ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۰۶۶ھ بتایا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے ۱۰۷۶ھ بھی لکھا ہے۔ یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ مثنوی ’پھول بن‘ خالص ترجمہ یا تلخیص نہیں ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عبدالقادر سروری رقم طراز ہیں:

”مصنف نے قصے کے خاکے کو اپنے زمانے اور ماحول کے چوکھٹے میں بٹھایا ہے۔
چنانچہ اس کے اشخاص قصہ طرز معاشرت کے لحاظ سے اس کے عہد کے انسان ہیں۔
مثنوی میں جگہ جگہ قطب شاہی محلات اور باغوں سے جزئیات اخذ کیے گئے ہیں۔“

(ڈاکٹر عبدالقادر سروری، اردو مثنوی کا ارتقا، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۸ء، ص: ۸۵، ۸۶)

ابن نشاٹی کی مثنوی ’پھول بن‘ کے ادبی شاہ کار ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ ابن نشاٹی نے اس مثنوی میں انتالیس صنعتوں کے استعمال کا غیر معمولی اہتمام کیا ہے۔ قدم قدم پر لفظی و معنوی صنائع و بدائع کو بروئے کار لاکر انھوں نے اپنی انشا پردازی کا پختہ ثبوت دیا ہے۔ مثنوی ’پھول بن‘ کی سلاست و سادگی اور روانی جیسی خوبیاں پیش رو اساتذہ کے فارسی رنگ و آہنگ کی پیروی کا نتیجہ ہیں۔ یہ مثنوی فنی لطافت و دل کشی میں دکن کی ممتاز مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔

ابن نشاظمی کی ایک اور مثنوی 'طوطی نامہ' بھی ہے جو ہندوستان کا ایک مقبول قصہ ہے۔ گارساں دتاسی نے اس کا سن تصنیف ۱۰۴۹ھ بیان کیا ہے لیکن شمس اللہ قادری نے 'اُردوئے قدیم' میں اسٹوارٹ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ مثنوی ۱۰۶۴ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ یہ بخشی کی فارسی کتاب کا ترجمہ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ اس کا چہ بہ ہے۔ ابن نشاظمی اپنے عہد کے بے حد ممتاز اور باکمال شاعر تھے۔ ان کی شاعرانہ عظمت کے تعلق سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب 'دکنی ادب کی تاریخ' میں لکھا ہے:

”ابن نشاظمی اس دور کا ایسا صاحب کمال تھا جس نے شاعروں اور ادیبوں کو درباری اور سرکاری قدر دانی سے بے نیاز ہو کر شعر و سخن میں مصروف رہنے کا راستہ سمجھا دیا۔ اس کے بعد کئی ایسے شاعروں اور ادیبوں کے نام ملتے ہیں جن کی تصنیف و تالیف کا شاہی سرپرستی سے کوئی تعلق ظاہر نہیں ہوتا۔ ان میں سید بلاتی شاہ راجو، میران جی خدا نما، فاروقی اور میران یعقوب کے کارنامے مشہور ہیں جو عبداللہ قطب شاہ کا تحفہ ہیں۔“

(ڈاکٹر محی الدین قادری زور، دکنی ادب کی تاریخ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۰ء، ص: ۶۸)

15.3.2 ابن نشاظمی کی مثنوی 'پھول بن' کا جائزہ

ابن نشاظمی کی مثنوی 'پھول بن' ایک عشقیہ مثنوی ہے جو ۱۰۶۶ھ میں منظر عام پر آئی۔ اس سے پہلے بھی کئی اہم عشقیہ مثنویاں تحریر کی جا چکی تھیں۔ مثلاً مثنوی 'قطب مشتری'، 'سیف الملوک و بدیع الجمال'، 'مینا ستونتی' اور 'طوطا مینا' وغیرہ۔ ان مثنویوں میں روانی اور سلاست کے ساتھ ساتھ زور بیان کی خوبیاں قابل توجہ تھیں۔ ابن نشاظمی نے بھی 'پھول بن' میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ داخلی شواہد سے پتا چلتا ہے کہ ابتدا میں ابن نشاظمی کی طبیعت شاعری کی طرف مائل نہیں تھی لیکن جب انھوں نے اپنے عہد کے شعرا کی قدر دانی دیکھی تو وہ بھی شاعری کی طرف مائل ہوئے اور مثنوی نگاری میں اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں نے 'پھول بن' جیسی مثنوی اردو شعر و ادب کو دی۔ مثنوی 'پھول بن' فارسی تصنیف 'بساتین الانس' کے قصے پر مبنی ہے۔ ابن نشاظمی نے اصل قصے میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں اور اسے کئی ابواب میں تقسیم کر کے ہر باب کا آغاز ایک شعر سے کیا ہے جس میں اس باب کا خلاصہ آجاتا ہے۔ اگر تمام ابواب کے عنوانی اشعار کو یکجا کر دیں تو پوری مثنوی کالب والباب سامنے آجاتا ہے۔ مثنوی 'پھول بن' میں متعدد قصے بیان ہوئے ہیں۔ کچھ قصے طویل ہیں اور کچھ مختصر۔ مثنوی میں بعض قصے اصلی ہیں اور بعض فروعی نوعیت کے ہیں۔ اس پہلو پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے محمد اکبر الدین صدیقی نے لکھا ہے:

”پھول بن' میں تین بسیط قصوں کے علاوہ تین تعارفی قصے بھی ہیں جو ان قصوں کے لیے چوکھٹے کا

کام دیتے ہیں۔ یہ تمام قصے زاہد کی شخصیت سے منسوب کر دیے گئے ہیں لیکن زاہد اور کنجن پٹن

کا بادشاہ پھول بن کے اہم اشخاص نہیں ہیں بلکہ اس کے اہم اشخاص (یہ) ہیں؛

۱۔ ختن کے سوداگر کا بیٹا اور گجرات کے عابد کی بیٹی

۲۔ جوگیوں کا معتقد بادشاہ اس کا دغا باز وزیر اور رانی ستونی

۳۔ سمن بر، ہمایوں فال، ملک سندھ کا ناقبت اندیش بادشاہ اور اس کا مکار وزیر۔“

(محمد اکبر الدین صدیقی (مرتبہ)، ’پھول بن‘، ابن نشاطی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی،

۱۹۹۸ء، ص: ۷۰)

مذکورہ اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ مثنوی کے تین قصے اصل ہیں، باقی قصے فروغی ہیں۔ اس مثنوی میں ختن کے سوداگر کے قصے کو اصل قصہ شمار کیا گیا ہے۔ اس کہانی کا راوی سوداگر کا بیٹا ہے۔

مثنوی کے قصے کا خلاصہ: ختن کے سوداگر کے پاس مال و دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔ کاروبار ایسا پھیلا ہوا تھا کہ مال برداری کے لیے دریا میں لاتعداد کشتیاں تھیں۔ ایک مرتبہ تجارت کے سلسلے میں وہ گجرات گیا۔ اس سفر میں اس کے ہمراہ اس کا نوجوان بیٹا بھی تھا۔ یہ دونوں جہاں ٹھہرے تھے، وہیں پاس میں ایک زاہد پارسا سکونت پذیر تھا جس کی ایک حسین و جمیل بیٹی تھی۔ سوداگر کے بیٹے کے دل میں زاہد کی بیٹی کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ وہ اس کی گلی کے چکر کاٹنے لگا۔ اس کی تڑپ سے زاہد کی بیٹی بھی پگھلی اور وہ دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے۔ کسی نے اس کی خبر زاہد کو دے دی۔ آبرو جاتی ہوئی دیکھ کر مارے شرم کے وہ ایک حجرے میں بند ہو گیا اور بد دعا دی کہ ان دونوں کی صورت تبدیل ہو جائے۔ اس طرح وہ بلبل اور زاہد کی بیٹی گل کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ بادشاہ نے جب یہ سنا تو اسے خیال ہوا کہ خزانے میں ایک انگوٹھی ہے جسے اگر پھرایا جائے تو اصلی صورت واپس آسکتی ہے۔ چنانچہ اسی وقت خزانے سے انگوٹھی منگوا کر دونوں پر پھرائی گئی جس سے وہ دونوں پھر سے آدمی بن گئے۔ متن کے سوداگر کا قصہ یہاں مکمل ہو گیا۔

مثنوی ’پھول بن‘ کی دوسری اہم کہانی جوگیوں کے معتقد بادشاہ، اس کے دغا باز وزیر اور رانی ستونی سے شروع ہوتی ہے۔ جوگیوں کے معتقد بادشاہ، اس کے دغا باز وزیر اور رانی ستونی کے قصے میں نقل روح کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ مثنوی ’کدم راو پدم راو‘ میں بھی یہ موضوع برتا گیا ہے۔ ’پھول بن‘ کا بادشاہ جوگیوں کا بڑا معتقد تھا۔ مختلف ملکوں کے جوگی اس کے دربار میں آتے تھے جن کے ساتھ وہ احترام سے پیش آتا تھا۔ ایک دن ایک جوگی دربار میں آیا اور بادشاہ کے احترام اور جذبہ عقیدت سے خوش ہو کر اسے نقل روح کا منتر سکھایا۔ ایک دن بادشاہ اپنے وزیر کے ساتھ شکار کے لیے گیا۔ پھرتے پھرتے دونوں ایک جنگل میں پہنچ گئے جہاں انھیں ایک مردہ ہرن پڑا ہوا ملا۔ بادشاہ کے دل میں اس منتر کو آزمانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے اپنی روح ہرن کے جسم میں ڈال دی اور پھرنے لگا۔ دغا باز وزیر نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنی روح کو بادشاہ کے جسد میں منتقل کر کے وہ

سلطنت پر قابض ہو گیا۔ بادشاہ کی رانی 'ستونتی' نیک خاتون تھی۔ اسے بادشاہ کے بدلے ہوئے انداز سے شک ہو گیا۔ لہذا بادشاہ (دغا باز وزیر) جب اس کے قریب آنے کی کوشش کرتا تو وہ بہانہ کر کے ٹال جاتی۔ بادشاہ (جو ہرن کے جسم میں چلا گیا تھا) جب واپس آیا تو اسے اپنے جسد کو خالی دیکھ کر بڑا پچھتاوا ہوا اور سمجھ گیا کہ وزیر نے اسے دھوکہ دیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ پاس ہی ایک مردہ طوطا پڑا ہوا ہے۔ اس نے فوراً اس میں اپنی روح منتقل کی اور وہ بادشاہ کے شکاری کے گھر پر جا بیٹھا تا کہ شکاری اسے گرفتار کر کے بادشاہ کے یہاں بیچ دے۔ شکاری اسے فریبی بادشاہ کے پاس لے گیا۔ طوطے کی میٹھی باتیں سن کر فریبی بادشاہ بہت خوش ہوا اور اسے خرید کر وہیں رکھا جہاں۔ ستونتی رہتی تھی۔ ایک دن طوطے نے ستونتی سے پوچھا کہ تو کیوں بے چین ہے۔ اس نے وجہ بتائی۔ طوطے نے اس کی وفاداری دیکھی تو رو کر اپنا حال بیان کیا اور کہا کہ اب اگر وہ تجھ سے اظہارِ محبت کرے تو اس سے کہنا کہ مجھے شبہ ہے کہ تو وہ راجا نہیں ہے۔ چنانچہ طوطا نقل روح کا فن جانتا تھا۔ اس لیے طوطے نے ستونتی سے کہا کہ اگر تجھے پانے کے لیے اس پر وہ تیار ہو جائے تو مردہ قمری اس کے سامنے رکھ دینا۔ آگے کا کام میں سنبھال لوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ فریبی بادشاہ نے ستونتی پر قابو پانے کے لیے اپنی روح قمری میں منتقل کی۔ ادھر طوطا (جو اصل بادشاہ تھا) اپنے خالی جسد میں داخل ہو جاتا ہے اور قمری کو ہلاک کر کے واپس اپنی سلطنت سنبھال لیتا ہے۔

اس قصے کے بعد سمن بر اور ہمایوں فال کا قصہ شروع ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں ملک عجم کا ایک بادشاہ تھا جس کی بیٹی سمن بر انتہائی حسین تھی۔ مصر کا شاہ زادہ ہمایوں فال بھی اس کے حسن کی شہرت سن کر اس کا دیوانہ ہو گیا اور اسے دیکھنے کے لیے سمن بر کے شہر پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اسے اندازہ ہوا کہ صرف وہی اس کا دیوانہ نہیں بلکہ اس کے حسن کا ایک عالم دیوانہ ہے۔ کئی دنوں تک وہ اس کے دیدار کے لیے ترستا ہوا اس کے محل کے ارد گرد منڈلاتا رہا۔ پھر ایک دن قسمت اس پر مہربان ہوئی اور دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں۔ شروع میں سمن بر کو اس کی محبت کا یقین نہیں آتا ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ ہمایوں فال میں عاشقِ صادق کی ساری نشانیاں دیکھ لیتی ہے۔ چنانچہ دونوں ایک دوسرے پر دل و جان سے فدا ہو جاتے ہیں۔ دونوں کے ملنے کی خبریں پھیلتی ہیں۔ اس لیے دونوں گھر چھوڑ کر گھومتے گھومتے شہر سندھ میں جا کر 'بیت العاشقین' نام کے گھر میں مقیم ہو جاتے ہیں۔ یہاں انھیں کسی کا اندیشہ نہیں تھا۔ ہمایوں فال سمن بر سے کہتا ہے کہ یہ بات وہ کسی کو بھی نہ بتائے لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جہاں ہمایوں فال اور سمن بر رہتے تھے، وہاں ایک مالنی بھی رہتی تھی۔ وہ بادشاہ کے دربار میں پھول کے ہار بنا کر لے جایا کرتی تھی۔ سمن بر کے پاس بھی وہ پھول کے ہار، طرے اور چھوٹی وغیرہ گوندھ کر لایا کرتی تھی۔ اسے سمن بر سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ ایک دن اس نے سمن بر سے اس کے حالات پوچھے۔ سمن بر نے ہمایوں فال کی تاکید کے باوجود اپنا سارا حال اسے بتا دیا۔ ایک دن مالنی سمن بر کے ہاتھوں کا گندھا ہوا ہار لے کر بادشاہ کے دربار میں گئی۔ بادشاہ جو ہر روز مانی کے گندھے ہوئے پھولوں کے ہار دیکھتا تھا، آج اسے پھولوں کے

ان ہاروں میں ایک انوکھا پن نظر آیا۔ اس نے مالنی سے اصل بات معلوم کرنا چاہی تو وہ ٹال مٹول کرنے لگی لیکن جان کی دھمکی کے بعد اس نے سمن بر کے حسن کی خوب تعریف کی۔ اس کے حسن کی تعریف سن کر بادشاہ اس پر عاشق ہو گیا اور اس کے دیدار کا طالب ہوا۔ بادشاہ کشتی میں سوار ہو کر سمن بر کے محل کے نیچے پہنچ گیا جہاں سے اس نے سمن بر کے حسن کا مشاہدہ کیا۔ اس وقت وہ بال سکھانے کے لیے بیٹھی تھی اور ایسی نظر آتی تھی جیسی حوض کوثر پر حور۔ بادشاہ جب محل میں واپس گیا تو سارے درباریوں نے اس کا حال پوچھا۔ اس نے اپنی دیوانگی کی ساری کیفیت بیان کر دی۔ ایک وزیر بادشاہ سے کہا کہ وہ ندی کے کنارے ضیافت کی محفل آراستہ کرے اور شہزادہ ہمایوں فال کو دعوت پر بلائے۔ اسے خوب شراب پلائے۔ پھر اس سے شرط رکھے کہ وہ برہنہ ہو کر دریا سے کنول کا پھول توڑ لائے۔ اس کو آسان جان کر وہ کوئی عذر نہیں کرے گا۔ وہ دریا میں جائے گا اور مگر مچھوں کا لقمہ بن جائے گا۔ دوسری طرف سمن بر کو یہ گمان بھی نہیں ہوگا کہ آپ نے اسے دھوکہ دے کر قتل کیا ہے۔ سب کچھ طے شدہ پروگرام کے مطابق انجام پایا۔ شہزادہ ہمایوں فال دریا میں برہنہ چلا گیا اور کودتے ہی ایک مچھلی اسے نگل گئی۔ بادشاہ نے اپنے وزیر کو سمن بر کے پاس بھیجا تاکہ وہ اسے بادشاہ کے دل کی بات بتائے۔ وزیر نے سمن بر کو خوب سمجھایا لیکن بات نہیں بنی۔ یہ سن کر بادشاہ مایوس ہو گیا اور ساری سلطنت وزیر کے سپرد کر کے اس کے در پر جانکا تاکہ اسے کچھ ترس آئے لیکن یہ کوشش بھی بے سود ثابت ہوئی۔

دوسری طرف مصر کا بادشاہ اپنے بیٹے ہمایوں فال کی جدائی کے غم میں نڈھال تھا۔ کسی نے آکر شہزادے کے دھوکے سے مارے جانے کی بات بتائی۔ یہ سن کر وہ بے چین ہوا تھا۔ اس نے سندھ پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ جب سندھ کے بادشاہ کو اس کی خبر ملی تو قاصد کو بھیج کر اس کے آنے کا سبب دریافت کیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ ہم ڈرنے والے نہیں۔ مصری اور سندھی فوجوں میں معرکہ ہوتا ہے اور بالآخر مصری فوج کامیاب ہو جاتی ہے۔ مصری بادشاہ اپنے بیٹے کے خون کا بدلہ لینے کی بات کرتا ہے۔ بادشاہ کے خزانے میں ایک مچھلی ہوتی ہے جس پر طلسم لکھا ہوا ہے۔ وہ مچھلی جب پانی میں ڈالی جاتی ہے تو وہ سمندر کی تہ سے حقیقت ڈھونڈ نکالتی ہے۔ چنانچہ وہ مچھلی لائی گئی اور اسے پانی میں ڈالا گیا۔ پھر وہ پچھلی یہ خبر لائی کہ ایک مچھلی نے اسے نگل لیا تھا لیکن وہ اسے ہضم نہ کر سکی اور سمن بر کے جزیرے پر چھوڑ آئی ہے۔ اب وہ زندہ ہے اور پریوں کی قید میں ہے۔ اس خبر سے بادشاہ کو ذرا راحت محسوس ہوئی کہ اس کا فرزند بھی زندہ ہے۔ پھر وہ اپنے ملک مصر کو روانہ ہو گیا۔

ہمایوں فال کی جدائی میں ادھر سمن بر کا برا حال تھا۔ اسے جب شہزادے کے زندہ ہونے کی خبر ملی تو اس کی جان میں جان آئی۔ اس نے ہمایوں فال کو تلاش کرنے کے لیے جوگن کاروپ دھا لیا۔ جسم پر خاک ملی اور گلے میں کنٹھا ڈال کر روانہ ہو گئی۔ سمن بر متعدد مصیبتوں کا سامنا کرتے ہوئے ایک جزیرے پر پہنچی۔ وہاں اسے ایک محل دکھائی دیا۔ سمن بر کو پتا چلا کہ یہ پریوں کا مقام ہے۔ بادشاہ کے انتقال کے بعد جس کے زیر نگیں دیوا اور پریاں تھیں، بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے اب سلطنت کی ذمہ داری اس کی بیٹی 'ملک آرا' کے کاندھے پر آگئی۔ ایک دن

جب ملک آراسیر کو گئی تو ایک محل پر اس کی نگاہ پڑی جس میں سمن بر رہتی تھی۔ اپنے دید بانوں سے اس محل کی خوبی سننے کے بعد پری کو اسے دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ ملک آرا جب سمن بر سے ملی تو اس سے اس کا حال دریافت کیا۔ اس نے ملک آرا کو سارا قصہ بتا دیا۔ ملک آرا نے پریوں کے بادشاہ کو ایک خط بھیج دیا۔ پریوں کے بادشاہ نے خط کے مضمون سے واقف ہونے کے بعد اپنے خادموں سے شہزادے کا پتلا لگانے کے لیے کہا۔ بالآخر شہزادہ مل گیا اور اسے پریوں کے ساتھ ملک آرا کے نگر کو روانہ کر دیا گیا۔

دونوں بادشاہ یہ خبر سن کر بہت مسرور ہوئے، بڑی دعائیں دیں اور انظہارِ ممنونیت کے ساتھ خط کا جواب تحریر کیا۔ ملک آرا نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ دونوں کو ان کے ملک روانہ کر دیا۔ جب سمن بر اور ہمایوں فال اپنے شہر پہنچے تو انھیں دیکھنے کے لیے پوری خلقت اُمد پڑی اور سب کی خوشی دو گنی ہو گئی۔ پھر شہزادہ بے فکری سے اپنی سلطنت پر راج کرنے لگا۔ ’پھول بن‘ کا قصہ یہاں پر ختم ہو جاتا ہے۔

ابن نشاطی نے اپنی اس مثنوی میں ’قصہ در قصہ‘ کی تکنیک اختیار کی ہے اور کہانی بیان کرنے میں ’الف لیلہ‘ کا طریقہ اپنایا ہے۔ قصہ در قصہ کی تکنیک میں دو طریقے رائج ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی قصے کو نامکمل چھوڑ کر درمیان سے ہی ایک نیا قصہ شروع کر دیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک قصہ ختم کرنے کے بعد دوسرا نیا قصہ شروع کیا جائے۔ ابن نشاطی نے ’پھول بن‘ میں یہی دوسرا طریقہ اپنایا ہے۔ وہ قصہ مکمل ہونے کے بعد دوسرا نیا قصہ شروع کرتے ہیں۔ فطری طور پر آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہوگا کہ آخر اتنے فروغی قصوں کے بیان کا محرک کیا ہے؟ تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا سب سے بڑا محرک سامع کو نئے قصے کے لیے تیار کرنا تھا۔ ابن نشاطی نے انتہائی چابک دستی سے اپنے تین تعارفی قصوں کی مدد سے تین اہم کہانیاں بیان کی ہیں۔ ان کہانیوں میں عشقِ نقلِ روح، جو گیوں سے عقیدت، وفا شعاری، پند و نصیحت، فریب اور حرص و ہوس کے مختلف موضوعات بیان ہوئے ہیں۔

15.3.3 ابن نشاطی کی مثنوی ’پھول بن‘ کے ادبی محاسن

ابن نشاطی نے اپنی مثنوی ’پھول بن‘ میں شاعری کے دو اصول بتائے ہیں۔ ایک یہ کہ صنائع و بدائع، صحت قافیہ اور خوب صورت تشبیہات شاعری کی جان ہیں۔ دوسرا یہ کہ شاعری میں کوئی نصیحت کی بات ہونی چاہیے۔ نصیحت اور صنعت دونوں کی یکجائی سے بلند شاعری وجود میں آتی ہے۔ ’پھول بن‘ میں یہ دونوں ہی اصول موجود ہیں۔ اس مثنوی کی ایک نمایاں خوبی اس کے اسلوب کی سادگی ہے جو مثنوی میں ہر جگہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ملک سند کا بادشاہ اپنے مکار وزیر کو منبر کو پھسلانے کی ترکیبیں بتاتا ہے۔ واقعات کا یہ بیان سادگی و سلاست کا بہترین نمونہ ہے۔ ’پھول بن‘ کی دوسری خوبی اس کا زور بیان ہے۔ دراصل ابن نشاطی کو موزوں تشبیہات کی مدد سے کسی بھی خیال اور فکر کو مزید وضاحت سے پیش کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ

ابن نشاطی: حیات، ادبی کارنامے
اور پھول بن کا جائزہ

انہوں نے متنوع تشبیہات کی مدد سے مختلف مناظر اور واقعات کو وضاحت سے پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر بادشاہ کا دربار میں بیٹھنا ایک عام بات ہے۔ ابن نشاطی نے بادشاہ کی اہمیت اور شان کو رضوان کے حوالے سے اس طور پر ابھارا ہے کہ پورا منظر ہماری نگاہوں میں متحرک ہو جاتا ہے۔

سادگی اور زور بیان کے علاوہ جذبات نگاری اور جزئیات نگاری پھول بن کی اہم خوبیاں ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابن نشاطی کو جذبات نگاری اور جزئیات نگاری کے بیان میں غیر معمولی مہارت حاصل ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ کسی چیز کا نقشہ یا کسی کیفیت کا بیان سرسری طور پر نہیں کرتے بلکہ اس معاملے میں وہ پوری ہنرمندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی اس مثنوی میں قدم قدم پر جزئیات نگاری کے بہترین نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر پھول بن میں جہاں خط لکھنے کا بیان آیا ہے، وہاں صرف یہ نہیں کہا جاتا کہ خط کا مضمون اس طرح تھا بلکہ ایسی متنوع تفصیلات فراہم کی جاتی ہیں جن سے خط کی تیاری سے متعلق اہتمام کی پوری تصویر نگاہوں میں آ جاتی ہے۔ مثلاً منشی کو بلایا جانا، اس کے بیٹھنے کا انداز قلم کی خوبی، کاغذ کا رنگ، روشنائی کی خصوصیت، القاب و خطابات کے آداب وغیرہ۔ ان تفصیلات سے یہ خط صرف خطا نہیں رہتا بلکہ چیزے دیگر بن جاتا ہے۔ جزئیات نگاری کی ایک مثال یہاں پیش کی جا رہی ہے جس سے جزئیات نگاری میں ابن نشاطی کے کمال کا کچھ اندازہ ہوگا۔ یہ مثنوی میں وہ مقام ہے جب ہمایوں فال مچھلی کا لقمہ بن جاتا ہے اور سندھ کا بادشاہ یمن برکو پھسلانے کے لیے اپنے وزیر با تدبیر کو روانہ کرتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

سمن برتین دن تے دکھ میں پڑ کر رہی تھی پیو کے پچھڑے سوں اڑ کر
نہ سک تھا دیس کوں نانس کو آرام تپے ہو روئے بن دو جانہ تھا کام
لکیا سو پیو کے پچھڑے سوں پردیس کری بھڑکیاں سوں دل کی، رات کوں دیس
نہ رک سک سوز دل کا عشق کے ساتھ دھویں سوں آہ کے دن کوں کری رات
انجو ہو سوز سوں ہر روز و ہر شب اگن پانی میں تن من غرق تھا سب

ابن نشاطی نے متعدد اشعار میں سمن برکی جذباتی کیفیت کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ انہوں نے کہیں کہیں شاعرانہ کمالات کے اظہار کے لیے بھی جزئیات نگاری کو برتا ہے۔ کھانوں اور ہتھیاروں کے ذکر کے ساتھ اس قبیل کی اور چیزیں جہاں انہوں نے بیان کی ہیں، وہاں انہوں نے شاعرانہ کمالات کے بہترین نمونے یادگار چھوڑے ہیں۔

ابن نشاطی بنیادی طور پر ایک انشا پرداز تھے۔ اس وجہ سے دوسرے شعرا کے برخلاف ان کے یہاں عربی و فارسی الفاظ صحتِ املا و تلفظ کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ ضرورتِ شعری کی وجہ سے صحتِ الفاظ اور املا سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے قافیے کی صحت کا بھی خیال رکھا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کی اس

خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ”اس مثنوی کی یہ انفرادیت ہے کہ اس میں شاعر نے نظم میں انشا کی خوبیاں پیدا کی ہیں۔“ ابن نشاطی نے مختلف اشیا کے بیان میں توازن قائم رکھا ہے۔ انھوں نے طلوع و غروب آفتاب، چاندنی رات، میدان جنگ لشکروں کی تیاری اور رزم و بزم کے نقشے پیش کرنے میں انتہائی ہنرمندی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ باغات اور محلات کے مناظر پیش کرتے ہوئے انھوں نے ہمارے سامنے عہد قطب شاہی کے تعمیراتی نمونوں کو کمال ہوشیاری سے پیش کیا ہے۔

کردار نگاری کے نقطہ نظر سے بھی یہ مثنوی کافی اہمیت کی حامل ہے۔ ابن نشاطی نے عام انسانی کردار کے ساتھ ساتھ فوق فطری کردار بھی پیش کیے ہیں۔ نسوانی کرداروں بالخصوص مینا ستونتی اور سمن بر کے کردار کو پیش کرنے میں ابن نشاطی نے اپنے فن کا جو ہر دکھایا ہے۔ یہ دونوں نسوانی کردار اپنی استقامت اور وفا شعاری کی وجہ سے سامعین کے حافطے میں محفوظ رہ جاتے ہیں۔ ابن نشاطی کی کردار نگاری کا کمال یہ ہے کہ ان کے خلق کیے ہوئے سارے کردار اپنے منفرد خدو خال کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔

ابن نشاطی نے ’پھول بن‘ میں اپنی انشا پر دازی کے اظہار کے لیے صنّاع و بدائع کا بھی کثرت سے استعمال کیا ہے۔ ان صنعتوں میں لفظی اور معنوی دونوں طرح کی صنعتیں شامل ہیں:

تجنیس تام مائل:

سدا صحت کی راحت سوں جلاتوں

مچ آئینہ کوں دے دل کے جلاتوں

تلمیح:

یوود ہے جس گیا ڈھنڈ نے سکندر

کتے تھے اس کے لب پر کوئی نجھا کر

مجاز مرسل:

کہاں زلفاں کوں انگلیاں سو لیتی

کنگوی آرے تلے گر سر نہ دیتی

مراعاة العظیر:

بندے شبنم کے موتی گل کے پھولوں

پڑے دیک بلبلاں آنے کے ہولوں

حسن تعلیل:

لرزتا ہے گگن پر سوراجنوں

تو دیکھیا ہے جدھیاں تے کراو پر موں

مبالغہ:

مٹھائی میں مٹھے تھے انگلیں تے

وہاں چشمے جو نکلے تے زمیں تے

15.3.4 حاصل

ابن نشاٹی کا شمار قطب شاہی عہد کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے حالات زندگی کے بارے میں بہت زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ مثنوی 'پھول بن' سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ابن نشاٹی کے نام سے معروف تھے لیکن جدید تحقیق کے مطابق ان کا نام شیخ محمد مظہر الدین اور والد کا نام شیخ فخر الدین ہے جو ایک اچھے شاعر تھے اور نشاٹی تخلص کرتے تھے۔ اپنے والد کی نسبت سے ہی انھوں نے ابن نشاٹی تخلص اختیار کیا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے ابن نشاٹی کی تاریخ پیدائش ۱۶۳۱ء تا ۱۶۳۵ء کے درمیان کے زمانے کو قرار دیا ہے۔ مثنوی 'پھول بن' کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابن نشاٹی کی تعلیم و تربیت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی۔ فارسی ادب اور شاعری کے علاوہ فنِ بلاغت اور خاص طور پر علمِ معانی بدیع پر انھیں غیر معمولی مہارت تھی۔ ابن نشاٹی انشا پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ گول کنڈہ کے بادشاہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار کے معزز عہدے دار بھی تھے۔ ابن نشاٹی نے مثنوی کے علاوہ دیگر شعری اصناف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ زمانے کے چلن کے مطابق انھوں نے غزلیں بھی نہیں کہیں سوائے ایک غزل کے جو 'پھول بن' میں شامل ہے۔ ابن نشاٹی کی سب سے مشہور مثنوی 'پھول بن' ہے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور مثنوی 'طوطی نامہ' بھی ہے جو ہندوستان کا ایک مقبول قصہ ہے۔ گارساں دتاسی نے اس کا سن تصنیف ۱۰۴۹ھ بیان کیا ہے لیکن شمس اللہ قادری نے 'اردوئے قدیم' میں اسٹوارٹ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ مثنوی ۱۰۶۲ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔ یہ بخشی کی فارسی کتاب کا ترجمہ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ اس کا چرہ ہے۔

ابن نشاٹی نے اپنی مشہور مثنوی 'پھول بن' ۱۶۵۵ء میں صرف تین ماہ میں مکمل کی جو ۴۴۷ شععار پر مشتمل ہے۔ 'پھول بن' ایک عشقیہ مثنوی ہے جو ایک فارسی قصہ 'بساتین الانس' کا چرہ ہے۔ جس کو ابن نشاٹی نے سادگی اور زور بیان کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا ہے۔ 'پھول بن' قصہ در قصہ کی تکنیک میں لکھی گئی مثنوی ہے جس میں تین تعارفی اور تین تفصیلی قصے ہیں۔ ابن نشاٹی نے اپنی اس مثنوی میں جذبات نگاری اور جزئیات نگاری کے ایسے دل کش مرقعے پیش کیے ہیں کہ قاری پڑھتے پڑھتے کھوجاتا ہے۔ شاعر ابن نشاٹی نے اس میں انتالیس قسم کے صنائع و بدائع کے حسین استعمال سے اس کو ایک ادبی شاہ کار بنا دیا ہے۔ ابن نشاٹی کی اس مثنوی کی نظم میں انشا کی تمام خوبیاں سمٹ آئی ہیں۔ انھوں نے نادر تشبیہات کی مدد سے منظر کو دل کش متحرک اور جان دار بنا دیا ہے۔ مثنوی 'پھول بن' کے تسلسل میں کہیں بھی انقطاع نہیں ہے۔ تمام ماہرین نے اس کی ادبی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو مثنوی کی کوئی تاریخ 'پھول بن' کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کی جاسکتی۔

15.4 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے:

- ابن نشاطی کے سوانحی احوال و کوائف سے واقفیت حاصل کی۔
- ابن نشاطی کے ادبی کارناموں کے بارے میں معلومات حاصل کی۔
- ابن نشاطی کی مثنوی نگاری کی خصوصیات و امتیازات سے آگہی حاصل کی۔
- ابن نشاطی کی مثنوی 'پھول بن' سے بحث کی۔
- ابن نشاطی کی مثنوی 'پھول بن' کے تجزیے کے ذریعے اس کی انفرادیت کو سمجھا۔

15.5 اپنا امتحان خود لیجیے

- ۱۔ ابن نشاطی کے سوانحی احوال و کوائف پر مختصر اظہار خیال کیجیے۔
- ۲۔ ابن نشاطی نے مثنوی 'پھول بن' کب اور کتنے دنوں میں مکمل کی اور یہ مثنوی کتنے اشعار پر مشتمل ہے؟
- ۳۔ ابن نشاطی کی مثنوی 'پھول بن' کا موضوع کیا ہے؟
- ۴۔ ابن نشاطی نے مثنوی 'پھول بن' میں قصے کے بیان میں کس تکنیک کو اختیار کیا ہے؟
- ۵۔ مثنوی 'پھول بن' کی فنی خصوصیات و امتیازات سے مختصر بحث کیجیے۔

15.6 سوالوں کے جوابات

- ۱۔ ابن نشاطی کا شمار قطب شاہی عہد کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کے حالات زندگی کے بارے میں بہت زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ مثنوی 'پھول بن' سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ابن نشاطی کے نام سے معروف تھے لیکن جدید تحقیق کے مطابق ان کا نام شیخ محمد مظہر الدین اور والد کا نام شیخ فخر الدین ہے جو ایک اچھے شاعر تھے اور نشاطی تخلص کرتے تھے۔ اپنے والد کی نسبت سے ہی انھوں نے ابن نشاطی تخلص اختیار کیا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے ابن نشاطی کی تاریخ پیدائش ۱۶۳۱ء تا ۱۶۳۵ء کے درمیان کے زمانے کو قرار دیا ہے۔ مثنوی 'پھول بن' کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابن نشاطی کی تعلیم و تربیت اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی۔ فارسی ادب اور شاعری کے علاوہ فنِ بلاغت اور خاص طور پر علمِ معانی و بدیع پر انھیں غیر معمولی مہارت تھی۔ ابن نشاطی انشا پرداز ہونے کے ساتھ ساتھ گول کنڈہ کے بادشاہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دربار کے معزز عہدے دار بھی تھے۔ نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے کہ ابن

نشاطی نے مثنوی پھول بن، لکھنے سے پہلے شعر گوئی کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ وہ غزل گو شاعر تھا۔ وہ مثنوی ہی سے اپنی شہرت کا طالب ہے۔ مثنوی پھول بن سے یہ بھی

پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے حریفوں کو طنز کا نشانہ نہیں بناتے، وہ معاصرین کے بجائے پیش روؤں سے اپنے کلام کی داد چاہتے ہیں۔ وہ اپنے پیش روؤں میں فیروز محمود، خیالی اور حسن شوقی کے کمالات کے معترف تھے۔ دراصل ابن نشاطی نے ان ہی اساتذہ کرام کے اسلوب کی پیروی کی تھی۔ ان کو اندازہ تھا کہ ان کا تخلیقی اسلوب اگر کسی کے اسلوب سے ہم آہنگ ہے تو وہ ان کے پیش رو شاعر کا اسلوب ہے۔ اسی لیے انھوں نے ان کے نہ ہونے پر اظہارِ افسوس کیا ہے۔

۲۔ ابن نشاطی نے مثنوی پھول بن ۱۶۵۵ء میں صرف تین ماہ میں مکمل کی جو ۴۴۷ اشعار پر مشتمل ہے۔

۳۔ مثنوی پھول بن ایک عشقیہ مثنوی ہے جس میں شہزادی پھول بن کا قصہ ہے۔ اس مثنوی کی کہانیوں میں عشق نقل روح، جوگیوں سے عقیدت، وفا شعاری، بند و نصیحت، فریب اور حرص و ہوس وغیرہ مختلف موضوعات بیان ہوئے ہیں۔

۴۔ ابن نشاطی نے مثنوی پھول بن میں قصہ در قصہ کی تکنیک اختیار کی ہے اور کہانی بیان کرنے میں الف لیلہ کا طریقہ اپنایا ہے۔ قصہ در قصہ کی تکنیک میں دو طریقے رائج ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی قصے کو نامکمل چھوڑ کر درمیان سے ہی ایک نیا قصہ شروع کر دیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک قصہ ختم کرنے کے بعد دوسرا نیا قصہ شروع کیا جائے۔ ابن نشاطی نے پھول بن میں یہی دوسرا طریقہ اپنایا ہے۔ وہ قصہ مکمل ہونے کے بعد دوسرا نیا قصہ شروع کرتے ہیں۔ فطری طور پر آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہوگا کہ آخر اتنے فروغی قصوں کے بیان کا محرک کیا ہے؟ تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا سب سے بڑا محرک سامع کو نئے قصے کے لیے تیار کرنا تھا۔ ابن نشاطی نے انتہائی چابک دستی سے اپنے تین تعارفی قصوں کی مدد سے تین اہم کہانیاں بیان کی ہیں۔

۵۔ ابن نشاطی کی مثنوی پھول بن کے ادبی شاہ کار ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ ابن نشاطی نے اپنی اس مثنوی میں انتالیس صنعتوں کے استعمال کا غیر معمولی اہتمام کیا ہے۔ قدم قدم پر لفظی و معنوی صنائع و بدائع کو بروئے کار لا کر انھوں نے اپنی انشا پر دازی کا پختہ ثبوت پیش کیا ہے۔ مثنوی پھول بن کی سلاست و سادگی اور روانی جیسی خوبیاں پیش رو اساتذہ کے فارسی رنگ و آہنگ کی پیروی کا نتیجہ ہیں۔ یہ مثنوی فنی لطافت اور دل کشی میں دکن کی ممتاز مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔

15.7 فرہنگ

(الفاظ)	(معانی)
ادب پرور	: ادب کی سرپرستی کرنے والا
مشاطگی	: سجانے اور سنوارنے کا کام
محاسن	: حسن کی جمع، خوبیاں
پردہ خفا	: پوشیدگی کے پردے میں، مراد مخفی ہونا
گونا گوں	: مختلف قسم کا
پیش رو	: آگے آگے چلنے والا، مراد شاعر کے زمانے سے پہلے کے شعرا
سخن گستری	: شعر کہنا
صنائع و بدائع	: وہ عجیب و غریب نکات اور باریکیاں جو نظم یا کلام میں اس کی خوبی اور اپنی طبیعت کی رسائی ظاہر کرنے کے واسطے عمداً لائی جاتیں
معتقد	: اعتقاد رکھنے والا
ناعاقبت اندیش	: انجام نہ سوچنے والا
بد بخت	: بد نصیب
سرو	: ایک مشہور درخت جو سیدھا مخروطی شکل کا ہوتا ہے
سینہ کوبی	: سینہ پیٹنا
نقل روح	: روح کی منتقلی
جسد	: جسم
قمری	: فاختہ کی قسم کا ایک پرندہ
کوثر	: جنت کی ایک نہر، جنت کا حوض
برہنہ	: ننگا
مہر	: پیار، محبت
طلسم	: جادو، جادو کے خطوط اور نقوش
دید بان	: پہرے دار

ابن نشاۃ: حیات، ادبی کارنامے
اور پھول بن کا جائزہ

ممنونیت : احسان مندی
ترک و احتشام : شان و شوکت
خلقت : لوگ، عوام
گنج : خزانہ
مار : سانپ

15.8 کتب برائے مطالعہ

- ۱۔ دکن میں اردو : نصیر الدین ہاشمی
- ۲۔ دکنی ادب کی تاریخ : ڈاکٹر محی الدین قادری زور
- ۳۔ تاریخ ادب اردو جلد اول (قدیم دور) : ڈاکٹر جمیل جالبی
- ۴۔ پھول بن (مرتبہ) : محمد اکبر الدین صدیقی
- ۵۔ اردو مثنوی کا ارتقا : عبدالقادر سروری



ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

ساخت

اغراض و مقاصد

تمہید

میر حسن: حیات، مثنوی نگاری

• حیات و خدمات

• مثنوی نگاری

• مثنوی سحر البیان

• متن کی تشریح

حاصل مطالعہ

آپ نے کیا سیکھا

اپنا امتحان خود لیجیے

کتب برائے مطالعہ

اغراض و مقاصد:

• میر حسن حیات و خدمات سے تعارف

• مثنوی گلزار نسیم سے مکمل واقفیت

تمہید:

مثنوی کا لفظ مثنوی سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں دو دو کے یا دو کیا گیا وغیرہ۔ شعری اصطلاح میں مثنوی اس کلام کو کہتے ہیں جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر شعر کا قافیہ بقیہ اشعار کے قافیے سے مختلف ہوتا ہے البتہ مثنوی کے تمام اشعار ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔ مثنوی کے اجزایہ ترکیبی میں حمد، نعت، منقبت، مناجات، مدح بادشاہ/ امراء، تعریف سخن یا تعریف خامہ، سبب تالیف، اصل قصہ، اختتام شامل ہوتے ہیں۔ امداد امام اثر نے مثنوی کو موضوع کے اعتبار سے حسب ذیل حصوں میں تقسیم کیا ہے:

1- رزمیہ مضامین

2- بزمیہ مضامین

3- حکمت آموز مضامین

4- تصوف آموز مضامین

5- متفرق مضامین

مثنوی میں عموماً طویل قصے بیان کیے جاتے ہیں نثر میں جو کام ایک ناول سے لیا جاتا ہے، شاعری میں وہی کام مثنوی سے لیا جاتا ہے۔ مثنوی ایک وسیع صنف سخن ہے اور تاریخی، اخلاقی اور مذہبی موضوعات پر کئی ایک خوبصورت مثنویاں کہی گئی ہیں۔ مثنوی عموماً چھوٹی بحروں میں کہی جاتی ہے اور اس کے لیے چند بحریں مخصوص بھی ہیں اور شعرا عموماً اس کی پاسداری کرتے ہیں لیکن مثنوی میں شعروں کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں ہے، کچھ مثنویاں تو کئی کئی ہزار اشعار پر مشتمل ہیں۔ مثنوی کے لئے عام طور پر 7 بحریں مروج ہیں۔

موضوع کے لحاظ سے مثنوی کا دامن بہت وسیع اور کشادہ ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین احسن مارہروی کے حوالے سے لکھتے ہیں ”جذبات انسانی، مناظر قدرت، تاریخی واقعات جس خوش اسلوبی اور روانی سے مثنوی میں سما سکتے ہیں ان کی اتنی گنجائش کسی صنف سخن میں نہیں۔ زندگی کے تمام شعبے سوانح رزمیہ ہوں یا تاریخی، عشقیہ ہوں یا اخلاقی، فلسفیانہ ہوں یا افسانہ غرض کیتھیل کی کھپت مثنوی میں ہوتی ہے“۔ (اردو مثنوی شمالی ہند میں: ص 56)

مولانا شبلی کی تقسیم مثنوی:

مولانا شبلی نے شعرا لعم میں مثنوی کی تقسیم درج ذیل طریقے پر کی ہے:

رزمیہ، عشقیہ، اخلاقی قصہ و افسانہ، تصوف و فلسفہ۔ مولانا شبلی کی یہ تقسیم فارسی مثنویوں کے پیش نظر کی گئی ہیں۔ (اردو مثنوی شمالی ہند میں: ص 89)

امداد امام اثر نے کاشف الحقائق میں مثنویوں کو موضوع کے لحاظ سے رزمیہ، بزم، حکمت، تصوف اور دیگر متفرقات میں تقسیم کیا ہے۔

مثنوی کے اوزان:

سب سے پہلے مثنوی کے اوزان متعین اور مقرر کرنے کا سہرا سعادت یا رخاں رنگین کے سر بندھا۔ مثنوی کیلئے سات اوزان مقرر ہیں:

1- بحر سربج مسدس مطوی موقوف: مقتعلن مقتعلن فاعلات (نشاط امید، الطاف حسین حالی)

2- بحر ہزج مسدس مقصور یا محذوف: مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل (بکٹ کہانی، افضل)

3- بحر ہزج مسدس مقبوض مقصور یا محذوف: مفعول مفاعیلن فاعولن (گلزار نسیم، دیانتگر نسیم)

4- خفیف مسدس مجنون مقطوع: فاعلاتن مفاعیلن فاعولن (زہر عشق، شوق لکھنوی)

5- بحر متقارب مثنی مقصور یا محذوف: فاعولن فاعولن فاعولن (سحر البیان، میر حسن)

6- رمل مسدس مقصور یا محذوف: فاعلاتن فاعلاتن فاعلات (رموز العارفین، میر حسن)

7- رمل مسدس مجنون مقطوع: فاعلاتن فاعلاتن فاعولن (قول غمیں، مومن)

میر حسن حیات:

مثنوی سحرالبیان کے تخلیق کار میر حسن کا اصلی نام ”غلام حسن“ تھا۔ ”حسن“، تخلص اختیار کرتے تھے اس لیے ”میر حسن“ کے نام سے شہرت پائی۔ آپ کے والد کا نام میر ضاحک تھا جو اپنے وقت کے بڑے جہوگو شاعر تھے۔ میر ضاحک کا شمار میر تقی میر اور سودا کے ہم عصر شعراء میں ہوتا ہے۔ قدیم تذکرہ نگاروں نے میر حسن کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی تاریخ ولادت کے متعلق کچھ پتہ نہیں چلتا۔

ڈاکٹر رام بابوسکینہ کی تحقیق کے مطابق میر حسن کی ولادت پرانی دلی کے محلہ سیدواڑہ میں 1140 ہجری میں ہوئی۔ (تاریخ ادب اردو، ص: 89) ڈاکٹر وحید قریشی نے بعض قرائن سے میر حسن کی سال پیدائش 1154 ہجری کے قریب قرار دیا۔ وفات پر تو سب کا اتفاق ہے کہ ان کی وفات 1201ھ مطابق 1874ء ہے۔ تاریخ وفات کے متعلق مصحفی کا مصرعہ ”شاعر شیریں زبان تاریخ یافت“ بہت مشہور ہے جس سے تاریخ وفات 1201ھ نکلتی ہے۔ میر حسن نے تقریباً 50 سال کی عمر پائی۔

میر حسن نے اپنی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر اپنے والد محترم کے پاس سے شروع کی اور انہیں کو اپنا کلام دکھلایا، بعد میں خواجہ میر درد کی شاگردی اختیار۔ لکھنو؟ آنے کے بعد میر ضیاء اور میر سودا کی شاگردی اختیار کی۔ عربی زبان پر میر حسن کی دسترس خاطر خواہ نہیں تھی، لیکن فارسی زبان پہ عبور حاصل تھا، جس کا جیتا جاگتا نمونہ ”تذکرہ شعراء اردو“ کی شکل میں موجود ہے جو اعلیٰ درجہ کی فارسی تصنیف ہے۔

میر حسن کے جد اعلیٰ عہد شاہجہانی کے اواخر میں ہرات سے آکر دہلی میں بس گئے تھے۔ یہیں 1727ء میں میر حسن پیدا ہوئے۔ ان کے والد میر ضاحک شاعر تھے جن کی طبیعت ہزل اور جھوکی طرف مائل تھی۔ سودا سے ان کی خوب نوک جھونک چلتی تھی۔ میر حسن نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی والد سے حاصل کی۔ شعر و شاعری کا شوق لڑپن سے تھا وہ خواجہ میر درد کی صحبت میں رہنے لگے اور وہی شاعری میں ان کے پہلے استاد تھے۔ جس زمانہ میں میر حسن نے جوانی میں قدم رکھا وہ دہلی اور دہلی والوں کے لئے سخت ابتلاء کا زمانہ تھا۔ معاشی حالات ابتر تھے اور ہر طرف لوٹ مار مچی ہوئی تھی۔ اکثر شرفاء جان و مال کی حفاظت کے لئے دہلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ سودا، میر تقی میر، جرات، سوز سب دہلی چھوڑ کر اودھ کا رخ کر چکے تھے۔ میر ضاحک نے بھی اہل و عیال کے ساتھ دہلی کو خیر باد کہا۔ میر حسن کو دہلی چھوڑنے کا بہت غم ہوا۔

ہوا آوارہ ہندستان جب سے

قضا پورب میں لائی مجھ کو تب سے

لگا تھا ایک بت سے واں مرادل

ہوئی اس سے جدائی سخت مشکل

فیض آباد جاتے ہوئے وہ لکھنؤ میں ٹھہرے اس وقت لکھنؤ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جو ان کو بالکل پسند نہیں آیا اور اس کی جھوکہ ڈالی۔

جب آیا میں دیار لکھنؤ میں

ند دیکھا کچھ بہار لکھنؤ میں

ہر ایک کوچہ یہاں تک تنگ تر ہے

ہوا کا بھی وہاں مشکل گزر ہے

سوائے تودہ؟ خاک اور پانی

یہاں دیکھی ہر اک شے کی گرانی

زبس کوفہ سے یہ شہر ہم عدد ہے

اگر شیعہ کہیں نیک اس کو بد ہے

لکھنو؟ کی یہ جہان کو بہت مہنگی پڑی۔ یہ آصف الدولہ کے خوابوں کا لکھنو؟ تھا جسے وہ رشک شاہ جہاں آباد بنانا چاہتے تھے۔ اس لکھنو؟ کو کوفہ کہا جانا اور ساتھ ہی یہ کہنا کہ کسی شیعہ کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اس شہر کو اچھا کہے آصف الدولہ کے دل میں چھ گیا۔

میر حسن دہلی سے فیض آباد پہنچے اور پہلے آصف الدولہ کے ماموں سالار جنگ اور پھر ان کے بیٹے سردار جنگ مرزا نوازش علی خان کے ملازم ہو گئے۔ 1770ء میں جب آصف الدولہ نے لکھنو؟ کو پایہ؟ تخت بنالیا تو سالار جنگ بھی اپنے متعلقین کے ساتھ لکھنو؟ منتقل ہو گئے جن کے ساتھ میر حسن کو بھی جانا پڑا۔

لکھنو میں آصف الدولہ کی ناراضگی کی وجہ سے ان پر عرصہ؟ حیات تنگ تھا۔ انہوں نے مثنوی سحر البیان نواب کو راضی کرنے کے لئے ہی لکھی تھی۔ جس کے ساتھ ایک قصیدہ بھی تھا اور نواب سے حضرت علی اور آل رسول کا واسطہ دے کر معافی طلب کی گئی تھی۔ 1784 میں یہ مثنوی مکمل ہوئی تو نواب قاسم علی خاں بہادر نے کہا کہ مجھے یہ مثنوی دو کہ میں اسے تمہاری طرف سے نواب کے حضور میں لے جاؤں لیکن میر حسن نے ان کا اعتبار نہ کیا اور ان کو بھی ناراض کر بیٹھے پھر جب کسی تقریب سے ان کی رسائی دربار میں ہوئی تو نواب قاسم نے انتقاماً میر حسن کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

میر حسن نے سحر البیان، گلزار ارم اور رموز العارفین کے علاوہ کئی دوسری مثنویاں بھی لکھیں۔ ان کی اک مثنوی خوان نعمت آصف الدولہ کے دسترخوان پر چنے جانے والے کھانوں کے بارے میں ہے۔ رموز العارفین اپنے وقت میں خاصی مقبول تھی جس میں عارفانہ اور مصلحانہ مضامین نظم ہوئے ہیں۔ لیکن جو مقبولیت ان کی آخری مثنوی سحر البیان کو ملی ویسی کسی مثنوی کو نہیں ملی۔ اس میں شک نہیں سحر البیان میں میر حسن نے محاکات اور جزئیات نگاری کو درجہ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ یہی بات ان کے پوتے میر انیس کوورش میں ملی جنہوں نے مرثیہ کے میدان میں اس سے کام لیا۔ میر حسن کے چار بیٹے تھے اور سبھی شاعر تھے جن میں انیس کے والد میر مستحسن خلیق نے بہت اچھے مرثیے لکھے لیکن بیٹے کی شہرت اور مقبولیت نے انہیں پس پشت ڈال دیا۔

میر حسن کی علمی خدمات:

میر حسن نے تمام اصناف سخن غزل، قصیدہ، مرثیہ، ہجو، مثنوی، رباعی، مخمس وغیرہ پر طبع آزمائی کی لیکن آپ کو شہرت مثنوی سحر البیان کی وجہ سے ملی۔ آپ کی مثنویوں کی تعداد 12 کے قریب بتائی جاتی ہیں جن کے نام حسب ذیل ہیں:

1- نقل کلاوت

2- نقل زن فاحشہ

3- ہجو قصائی

4- نقل قصائی

5- مثنوی شادی آصف الدولہ

6- مثنوی رموز العارفین

7- مثنوی ہجو حویلی

8- مثنوی گلزار ارم

9- مثنوی در تہنیت عمید

10- مثنوی قصر جواہر

11- مثنوی درخوان نعمت

12- مثنوی سحر البیان

لیکن ان میں شہرت سحر البیان، رموز العارفین اور گلزار ارم کو ملی۔ ان کے علاوہ میر حسن نے شعرائے اردو کا ایک تذکرہ ”تذکرۃ الشعراء“ فارسی زبان میں لکھا۔ اس میں تقریباً تین سو شعراء کے مختصر حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔

مثنوی سحر البیان:

اردو زبان میں جن دو مثنویوں کو سب سے زیادہ قبولیت اور شہرت ملی ان میں میر حسن کی ”سحر البیان“ اور دیا شنکر نسیم کی ”گلزار نسیم“ کا شمار ہوتا ہے۔ یہ دونوں مثنویاں اپنی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مماثل قرار دی گئی ہیں۔ مولانا حسین آزاد لکھتے ہیں ”ہمارے ملک سخن میں سینکڑوں مثنویاں لکھی گئی مگر ان میں فقط دو نئے ایسے ہیں جنہوں نے طبیعت کے موافقت سے قبول عام کی سند پائی ایک سحر البیان دوسرے گلزار نسیم اور تعجب یہ کہ دونوں کے راستے بالکل الگ الگ ہیں۔“ میر حسن کی یہ مثنوی اسم بالمسمیٰ ثابت ہوئی، جس نے بھی اس مثنوی کو پڑھا اس کی سحر بیانی کو یقیناً محسوس کیا۔ اس کی زبان اتنی صاف اور عام فہم ہے کہ یہ کہ پانا مشکل ہے کہ یہ آج سے دو سو سال پہلے کی زبان ہے۔

محمد حسین آزاد کہتے ہیں: ”زمانے نے اس کی سحر بیانی پر تمام شعراء اور تذکرہ نویسوں سے محض شہادت لکھوایا۔ اس کی صفائی بیان، لطف محاورہ شوخی مضمون اور طرز ادا کی نزاکت اور جواب و سوال کی نوک جھونک حد تو صیف سے باہر ہے۔ زبان چٹخارے بھرتی ہے اور نہیں کہہ سکتی کہ یہ کون سا میوہ ہے۔ جگت گرو مرزا سودا اور شاعروں کے سرتاج میر تقی میر نے بھی کئی مثنویاں لکھیں مگر فصاحت کے کتب خانہ کی الماری پر جگہ نہ پائی۔ میر حسن نے اسے لکھا اور ایسی صاف زبان، فصیح محاورے اور میٹھی گفتگو میں اور اس کیفیت کے ساتھ ادا کیا کہ اصل واقعہ کا نقشہ آنکھوں میں کھینچ گیا۔ اس نے خواص اہل سخن کی تعریف پر قناعت نہ کی بلکہ عوام جو حرف بھی نہیں پہچانتے وظیفوں کی طرح حفظ کرنے لگے۔“

سن تصنیف:

میر حسن نے اس مثنوی کو 1199ھ مطابق 1784-85ء میں تحریر کیا۔ میر حسن کی اس مثنوی کو ڈاکٹر گلکرسٹ کی فرمائش پر میر حسن کے دوست میر شیر علی افسوس نے اپنے مقدمے کے ساتھ 1803ء میں ترتیب دیا، جسے 1805ء میں فورٹ ولیم کالج کی طرف سے پہلی بار شائع کیا گیا۔ یہ مثنوی تقریباً ڈھائی ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں 38 اشعار حمد کے 26 اشعار نعت نبی کے، حضرت علی کرم اللہ وجہ کی شان میں 19 اور اصحاب پاک

کی مدح میں 14 اشعار کہے گئے ہیں۔ (اردو کی بہترین مثنویاں، ص: 32)

اندازِ بیان:

سحر البیان سادگی اور بے تکلفی کا نمونہ ہے۔ جہاں اشعار کا بے ساختہ پن اور سادہ پن دل پر اثر کرتا ہے وہیں شعریت بھی دماغ کو مسحور کرتی ہے۔ میر حسن کی سادگی میں بھی پرکاری ہے۔ سحر البیان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ محاوروں کا استعمال اور زبان کی رنگینی و دل کشی کسی دوسری مثنوی میں نہیں پائی جاتی۔ اس کے بہت سے اشعار آج بھی اپنی سادگی اور صداقت کی بدولت ضرب المثل ہیں۔

سدا عیشِ دوراں دکھاتا نہیں

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں

سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

ماحول کی عکاسی:

سحر البیان میں سماجی حالات اور معاشرت کے بھرپور نقشے پیش کیے گئے ہیں۔ قدیم زمانے کا لباس، زیورات، شادی بیاہ کی رسوم، درباروں کی دھوم دھام، محلات کا حال، شہزادوں کی ولادت پر خوشی اور جشن، نذر و نیاز اور تحائف وغیرہ کی مکمل تفصیل ہے۔ یہ مثنوی قطع نظر اس کے کہ جنوں اور پریوں کا قصہ ہے، شاہان اودھ کی درباری زندگی کا رنگین مرقع پیش کرتی ہے۔

بناٹھا ٹھنکار خانے کا سب

مہیا کرا سب عیش و طرب

دیا چوب کو پہلے تم سے ملا

لگی پھیلنے ہر طرف کو صدا

بچے شاد دیا نے جوواں اس گھڑی

ہوئی گرد و پیش آ کے خلقت کھڑی

کردار نگاری:

کردار کسی کہانی کا اہم جزو ہوتے ہیں۔ سحر البیان کے کردار نہایت عمدہ ہیں۔ خاص کردار بے نظیر اور بدر منیر ہیں۔ ان کے علاوہ پری ماہ رخ، نجم النساء اور

فیروز شاہ کے کردار ضمنی ہیں۔ میر حسن نے ان تمام کرداروں کو بہت بہتر انداز میں پیش کیا ہے۔

منظر نگاری:

منظر نگاری کا مفہوم یہ ہے کہ شاعر جس چیز کو دیکھے، الفاظ کے ذریعے اس طرح پیش کرے کہ اس کی اصل کیفیت آنکھوں کے سامنے آجائے۔ اردو ادب میں منظر نگاری میر حسن سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ مگر انہوں نے اس میں انفرادی شان پیدا کی۔ باغ کی بہار ہو یا جلوس کی شان، میر حسن اس کا ذکر اس لطف اور تفصیل سے کرتے ہیں کہ شاعری نقاشی بن جاتی ہے۔ خانہ باغ کا یہ حسین منظر دیکھیے:

گلوں کا لب نہر پر جھومنا

اسی اپنے عالم میں منہ چومنا

وہ جھک جھک کر گرنا خیابان پر

نشے کا سا عالم گلستان پر

چمن آتش گل سے دہکا ہوا

ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

رقص کا منظر:

کناری کے جوڑے چمکتے ہوئے

وہ پاؤں میں گھنگھر دکھلتے ہوئے

وہ بالے چمکتے ہوئے کان میں

پھڑکننا وہ نتھنے کا ہر آن میں

وہ گھٹنا وہ بڑھنا اداؤں کے ساتھ

دکھانا وہ رکھ رکھ کے بھاری پہ ہاتھ

جذبات نگاری:

جذبات نگاری شاعری کا ایک اہم جزو ہے اور میر حسن اس فن سے بخوبی واقف ہیں۔ ایک موقع پر شہزادہ غائب ہو گیا ہے، رقت انگیز انسانی جذبات کی تصویر

ملاحظہ ہو:

کوئی سر پر رکھ ہاتھ دل گیر ہو

گئی بیٹھ ماتم کی تصویر ہو

کوئی رکھ کے زیر زخماں چھڑی

رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی

شہزادے کے فراق میں بدرمنیر کی حالت:

دوانی سی ہر سو وہ پھرنے لگی
درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
خفا زندگانی سے ہونے لگی
بہانے سے جا جا کے سونے لگی

جزئیات نگاری:

داستان یا مثنوی میں جزئیات نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ میر حسن ہر واقعہ کو بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ شہزادی بدرمنیر کی خوبصورتی کے بیان میں زیورات اور لباس وغیرہ کی پوری تفصیل موجود ہے۔ اس طرح باغ کے بیان میں پورا منظر جزئیات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ
ہو رشک سے جس کے لالے کو داغ

بنی سنگ مرمر کی چوڑکی نہر
گئی چار سو اس کے پانی کی لہر

مکالمہ نگاری:

کردار نگاری و جذبات نگاری کے علاوہ کسی مسلسل کہانی میں مکالمہ کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے اس میں ڈرامائی انداز آ جاتا ہے۔ سحرالبیان میں مکالمہ نگاری کی خوبی بھی موجود ہے۔ ایک جگہ بدرمنیر شہزادے سے کہتی ہے:

مرو تم پری پروہ تم پر مرے
بس اب تم ذرا مجھ سے بیٹھو پرے

میں اس طرح کا دل لگاتی نہیں

یہ شرکت تو بندی کو بھاتی نہیں

حسن بیان:

سحرالبیان کی خصوصیات میں سے نمایاں خصوصیت حسن بیان ہے جس پر میر حسن کو بھی ناز ہے۔ زبان کی صفائی، محاورے کا لطف، مضمون کی شوخی، طرز ادا کی نزاکت اور سوال و جواب کا وصف نہایت ہی باکمال ہے۔ میر حسن کو اس خوبی کا احساس تھا۔

ذرا منصفو داد کی ہے یہ جا

کہ دریا سخن کا دیا ہے بہا

ز بس عمر کی اس کہانی میں صرف

تب ایسے یہ نکلے ہیں موتی سے حرف

نہیں مثنوی ہے یہ اک پھل بھڑی
مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی
نئی طرز ہے اور نئی ہے زباں
نہیں مثنوی ہے یہ سحر البیان
متن کی تدریس و تفہیم:

داستان وارد ہونے میں بے نظیر کے بدر منیر کے باغ میں اور شاہ زادی کے عاشق ہونے میں

کدھر ہے تو اے ساقی شوخ رنگ
کہ آیا ہوں میں بیٹھے بیٹھے بہ تنگ
پلا مجھ کو دار و کوئی تیز و تند
کہ ہوتا چلا ہے مرا ذہن کند
مرے تو سن طبع کو پر لگا
مجھے یاں سے لے چل فلک پراڑا
سنو ایک دن کی یہ تم واردات
اٹھا سیر کو بے نظیر ایک رات
ہو انا کہاں اس کا اک جاگزر
سہانا سا اک باغ آیا نظر
سفید ایک دیکھی عمارت بلند
کہ تھی نور میں چاندنی سے دو چند
وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جا بہ جا
وہ جاڑے کی آمد، وہ ٹھنڈی ہوا
وہ نکھر افلک اور مہ کا ظہور
گا شام سے صبح تک وقت نور
یہ عالم جو بھایا تو کوٹھے پہ آ
اترا اپنے گھوڑے سے اور سر جھکا

لگا جھانکنے اس مکاں کے تئیں
کہ دیکھوں تو یاں کوئی ہے یا نہیں

جو دیکھے تو ایسا کچھ آیا نظر
 کہ سب کچھ گیا اس کے جی سے اتر
 کہا جی سے: اب تو جو کچھ ہو سو ہو
 ذرا چل کے اس سیر کو دیکھ لو
 یہ کہہ، نیچے اتر ادا بے پانوہ
 نظر سے بچائے ہوئے چھانوہ
 الگ کھول ہاتھوں سے واں کے کواڑ
 چلا سایہ سایہ درختوں کی آڑ
 تھے اک طرف گنجان باہم درخت
 کہ لپٹے ہوں جس طرح مشتاق سخت
 لگاواں سے چھپ چھپ کے کرنے نظر
 درختوں سے جوں ماہ ہو جلوہ گر
 جو دیکھے تو صحبت عجب ہے وہاں
 عجب چاندنی ہے، عجب ہے سماں
 عجب صورتیں اور طرفہ محل
 چلا، دیکھتے ہی، دل اس کا نکل
 ملی جنس کی اس کو جو اپنی بو
 لگانے حیرت سے، حیران ہو
 نظر آئی وہاں چاندنی کی بہار
 کہ آنکھوں نے کی خیرگی اختیار

درو بام یک لخت سارے سفید
 ہر اک طاق، محراب صبح امید
 مغرق زمیں پر تماشائی کا فرش
 جھلک جس کی، لے فرش سے تابہ عرش
 زمیں کا طبق، آسماں کا طبق
 سنہری، رپہری ہوں جیسے ورق
 بلوریں دھرے ہر طرف سنگ فرش

کہ جس سے منور رہے رنگ فرش
 گئی اس کے عالم پہ جس دم نگاہ
 اور آیا نظر اس کو اک رشک ماہ
 طرح اس کی، ہر دل کی مانوس تھی
 کہ گویا وہ شیشے کی فانوس تھی
 کہیں، دیکھ اس کے تئیں ہوش مند
 پری کو کیا ہے گاشیشے میں بند
 ہر اک سمت واں نور کا ازدحام
 لگے آئے قد آدم تمام
 لپیٹے ہوئے بادلوں سے درخت
 زمین و ہوا، صاحب تاج و تخت
 ملبب وہ چو پڑ کی پاکیزہ نہر
 پڑے چشمہ؟ ماہ سے جس میں لہر
 پڑے اس میں فوارے چھٹتے ہوئے
 ہوا بیچ موتی سے لٹتے ہوئے
 ہوا میں وہ جگنو سے چمکیں بہم
 ملیں جلوہ؟ مہ کو زیر قدم
 فقط چاندنی میں کہاں طور یہ
 کہ طرہ نہ جب تک ملے اور یہ
 زمانہ زرافشاں، ہوا زرافشاں
 زمیں سے لگاتا سما زرافشاں
 گل و غنچہ، نسرین و تاج خروس
 زمین چمن سب جبین عروس
 خراماں زری پوش ہر ماہ و ش
 کریں، دیکھ کر مہر و مہ جن کو، غش
 کھڑا ایک نم گیرہ؟ زرنگار
 کہ تھے جس کی جھال رہے موتی نثار

جڑاؤ؟ وہ استادے الماس کے
 ڈھلے ایک سانچے کے، اک راس کے
 کھنچی ڈور ہر طرف زرتاری کی
 لڑی جوں کناری کے ہوں ہار کی
 کہوں کیا میں جھالر کی اس کی پھین
 کہ سورج کے ہو گرد جیسے کرن
 مغرق بچھی مسنداک جگمگی
 کہ تھی چاندنی جس کے قدموں لگی
 نہ پھولے سماتے تھے تیکے دھرے
 کہ تھے وے فقط حسن سے ہی بھرے

بلوریں صراحی وہ جام بلور
 دل و دیدہ وقف تماشاے نور
 زمیں نور کی، آسماں نور کا
 جدھر دیکھو ادھر سماں نور کا
 چمن سارے داؤ؟ دیوں سے بھرے
 جوانان شبو کے ہر جا پرے
 ستاروں کا مہتاب میں حال یوں
 کہ چونے میں پانی کے قطر یہوں جوں
 اگر کیجیے سایے او پر نگاہ
 تو ہے وہ بھی جوں سایہ؟ مہر و ماہ
 کرے ہے نگہ جس طرف کو گزر
 بجز نور آتا نہیں کچھ نظر
 کرے کون سے حسن کو انتخاب
 ہراک آسنے میں وہی ماہتاب
 نظر جس طرف جائے نزدیک و دور
 اسی ایک مہ کا ہے ہر جا ظہور
 نکل اپنی وحدت سے، کثرت میں آ

وہی نور ہے جلوہ گر جا بہ جا
 نئے رنگ سے ہر طرف ماہتاب
 وہی ایک نکتہ کہ جس کی کتاب
 حقیقت کی لیکن بصارت بھی ہو
 کہ دیکھے نہ، اس کے سوا غیر کو

تشریح

عزیز طلبا! ابھی آپ نے میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے جن منتخب اشعار کی قرات کی ہے، اس کی تشریح درج ذیل ہے:

- 1- اے شوخ رنگ تو کس جانب چلا گیا ہے۔ میں تجھے ڈھونڈھ کر بے قرار ہو رہا ہوں اور میں تنہا بیٹھ کر زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔
- 2- مجھ کو تیز اور اثر دار شراب پلاتا کہ میرا ذہن بیدار ہو سکے۔ کیونکہ شراب نہ ملنے کی وجہ سے میرا ذہن کام نہیں کر رہا ہے اور ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میرا ذہن کند ہو کر رہ گیا ہے۔
- 3- میری طبیعت کے گھوڑے کو پر عطا کر دے اور اب یہاں سے میرا دل پوری طرح بھر گیا ہے۔ تو مجھے یہاں سے فلک پراڑا کر لے چل۔
- 4- اب یہاں سے واردات کا ذکر شروع ہو گیا ہے کہ بے نظیر ایک رات کو سیر کے واسطے اٹھا۔ اور تفریح کی غرض سے چہل قدمی ہو گیا نکل گیا۔
- 5- اچانک ہی بے نظیر کا ایک ایسی جگہ سے گزر رہا تھا جہاں اسے ایک خوبصورت باغ دکھائی دیا۔
- 6- اسے ایک بلند و بالا عمارت دکھائی دی۔ جو اس قدر چمک رہی ہے کہ روشنی بھی اس کے سامنے پھینکی پڑ جائے۔ چاندنی رات میں جس طرح روشنی بکھری ہوئی ہوتی ہے اسی طرح سے عمارت سے بھی روشنی پھوٹی پڑ رہی ہے۔
- 7- جگہ جگہ چاندنی بکھری ہوئی تھی یعنی روشنی نے عمارت اور اس کے گرد و نواح کو پوری طرح سے روشن اور سہانا بنا رکھا تھا۔ اور موسم میں خنکی تھی اور ہوا بھی سرد تھی جو روح کو سرشار کر رہی تھی۔
- 8- ان اشعار میں منظر نگاری کو پیش کیا گیا ہے۔ آسمان کا رنگ بھی نکھرا ہوا ہے اور چاندنی بھی پوری آب و تاب کے ساتھ اپنے رنگ بکھیر رہی ہے۔ شام سے صبح تک بس نور کا ہی دور دورہ ہے۔
- 9- بے نظیر کو ان سبھی مناظر کے درمیان عمارت کی خوبصورتی اور اس کی چمک نے اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ کھوٹے پر آیا اور اپنے گھوڑے سے اتر کر سر جھکا کر دیکھنے لگا۔
- 10- تجسس میں اس نے مکان میں جھانکنے کی کوشش کی۔ اسے یہ جاننے کو بے تابی تھی کہ اس عمارت میں کوئی ہے یا نہیں۔ تجسس نے اس بات پر اسے مجبور کیا کہ ایک ایسی عمارت جو نور کا منظر پیش کر رہی ہے اس میں کوئی ہے بھی نہیں۔
- 11- جب بے نظیر نے وہاں جھانک کر دیکھا تو اسے ایسا نظر آیا کہ سارے خوشگوار مناظر اس کی نظر سے محو ہو گئے۔ اب تک جن فطری مناظر نے اسے

متاثر کیا تھا وہ سب اس نے بھلا دیئے۔

- 12 - بے نظیر نے اپنے آپ سے کہا کہ اب جو بھی آگے چل کر اس کی سیر کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں اندر کیا ہے۔ کسی بھی کام کو کرنے کے لیے انسان کو قوت ارادی مضبوط کرنی ہوتی ہے سو اس نے بھی یہی کیا تا کہ اندر جا کر پوری طرح سے گھر اور باغ کا معائنہ کر سکے۔
- 13 - خود سے ارادہ مضبوط کرنے کے بعد وہ دے پاؤں؟ یعنی نہایت آہستگی کے ساتھ وہ نیچے اتر اور بڑی احتیاط کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی اس کی پرچھائیں بھی نہ دیکھ سکے۔
- 14 - اس نے اپنے ہاتھ سے کواڑ کھولے اور اندر داخل ہو گیا۔ آہستگی سے چلتے ہوئے اس بات کی کوشش کرنے لگا کہ اس پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ درختوں کے سایوں کے ساتھ چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ کیونکہ درخت کے سایے میں تھوڑا اندھیرا ہے اور وہاں دیکھ لیے جانے کا خدشہ کم ہے۔
- 15 - باغ میں ایک جانب گھنے درختوں کا ہجوم ہے جو ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ یعنی وہ اس قدر نزدیک ہیں کہ انہیں دیکھ کر ایسا گمان ہوتا ہے کہ جس طرح عاشق معشوق سے لپٹا ہوتا ہے اسی طرح وہ درخت بھی آپس میں لپٹے ہوئے ہیں۔ مشتاق، خواہش مند ہونا، آرزو کرنا عاشق کی خصوصیات میں سے ہیں۔
- 16 - بے نظیر چھپ چھپ کر معائنہ کر رہا ہے کہ وہاں کیا کیا ہے۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ درختوں کے درمیان کوئی چاند بیٹھا ہوا ہے۔
- 17 - اس نے وہاں اطراف میں نظر ڈالی تو آس پاس کا منظر بہت خوشنما نظر آیا۔ جو ماہ رخ وہاں موجود ہے اس کے قریب کا منظر بہت سہانا ہے۔ چاندنی بھی ایک الگ ہی منظر پیش کر رہی ہے بلکہ وہ اور بھی زیادہ روشن دکھائی دے رہی ہے۔ باغ میں ایک عجیب سماں بکھرا ہوا ہے۔
- 18 - بے نظیر فرط حیرت میں غوطہ زن ہو رہا ہے۔ صورتیں اس کی آنکھوں میں گھر کر رہی ہیں۔ جب اس نے پری چہرہ اور ایسی خوبصورت صورتیں دیکھیں تو اس کا دل اس کے قابو سے باہر ہونے لگا۔
- 19 - بے نظیر کو انسانوں کی بوجھل ہوئی اسے یہ احساس ہوا کہ یہ لوگ اسی کی طرح انسان ہیں۔ ان کی خوبصورتی اور اطراف کی چکاچوند نے اسے حیرت زدہ کرنے کے ساتھ حیرانی میں مبتلا کر دیا۔
- 20 - بے نظیر کو باغ میں چاندنی کی بہاریں نظر آئیں۔ اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں یعنی حسن کی روشنی نے اس کی آنکھوں کو پوری طرح حیرانی میں مبتلا کر دیا۔
- 21 - سارے بام و در حسن کی روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔ ہر ایک طاق اور محراب صبح امید کا منظر پیش کر رہے تھے۔ صبح اور روشنی کا گہرا تعلق ہے اسی وجہ سے طاق اور محراب کی روشنی کو صبح امید کے مماثل قرار دیا ہے۔
- 22 - سونے چاندی اور جواہرات سے بھرپور تمامی (ریشمی کپڑے کی ایک قسم جس میں سنہری تاریں ہوتی ہیں) کا فرش ایک الگ ہی نظارہ پیش کر رہا ہے۔ جس کے نظارے کے لیے فرش تاعرش سب منظر رہتے ہیں۔ فرش تمامی سے مراد یہ ہے کہ زیورات اور جواہر کی نقاشی نے فرش کا منظر اس ریشمی کپڑے جیسا کر دیا ہے جس پر سنہری تار ہوتی ہے۔
- 23 - زمین اور آسمان کی سطح یا پرت اس طرح سے چمک رہی ہیں جیسے سفید چاندنی چمکتی ہے۔ آسمان اور زمین کے طبق کو سنہرے چمکدار ورق سے تشبیہ دی ہے۔ (رپہری، سفید چاندی جیسی)
- 24 - فرش پر ہر طرف بلور یعنی ایسا شفاف اور چمکیلا جوہر جو شیشے سے سخت اور زرد سے نرم ہوتا ہے بچھایا گیا ہے تاکہ فرش پوری طرح روشن رہے، چمکتا

رہے۔

25- جس وقت اس کی نظر ہر ایک چیز کا جائزہ لے رہی ہے اسی درمیان بے نظیر کو ایک ایسا حسین چہرہ نظر آیا جس پر چاند بھی رشک کرے۔ یعنی خوبصورتی میں وہ رشک ماہ کیٹا ویگانہ تھی۔

26- اس کی ادائیں، اس کے طور طریقوں سے محفل میں سبھی مانوس تھے۔ اس کا حسن اس قدر نکھرا ہوا تھا جیسے شیشے کا فانوس روشنی پھیلاتی ہے۔ بلور یا شیشے کا بنا ہوا شمع پوش جس میں پرانے زمانے میں شمعیں اور موجودہ دور میں بلب وغیرہ لگائے جاتے ہیں اس کو فانوس کہا جاتا ہے۔

27- عقل و خرد والے بھی اس کے حسن کو دیکھ کر ایسا سمجھتے کہ یہ کوئی پری ہے جسے شیشے میں بند کر دیا گیا ہے۔ پری کا تصور ہمارے یہاں حسن، بے پناہ خوبصورتی سے عبارت ہے۔ اسی لیے شاعر نے محبوبہ کو پری سے مماثل قرار دیا ہے۔

28- باغ میں ہر جانب بس نور ہی نور ہے۔ ہر طرف قد آدم آئینے لگے ہوئے ہیں۔ منظر نگاری اور جزئیات نگاری کے ضمن میں یہ اشعار بہت اہم ہیں۔

29- بادلوں نے درختوں کو اپنے آغوش میں لے رکھا ہے۔ زمین اور ہوا، تخت و تاج کے مالک سبھی بے خود اور حیران ہیں۔ جزئیات نگاری کرتے ہوئے منظر کو بہتر انداز میں پیش کیا جا رہا ہے۔

30- چوڑکی کی طرح دکھائی دینے والی پاکیزہ نہر بھی لبریز ہے۔ اور اس میں جو چشمہ رواں دواں ہے اس کی روانی کو چاند سے تشبیہ دیا ہے جس سے ایک لہر سی اٹھتی رہتی ہے۔ چوڑیا چوسر ایک مربع شکل کا چوبیس خانے کا بورڈ ہوتا ہے جس پر ایک کھیل کھیلا جاتا ہے۔ نہر کی شکل کو اسی سے مشابہ قرار دیا ہے۔

31- اس نہر میں فوراً رواں تھے اور موتیوں کی شکل میں ہوا میں اڑ رہے ہیں۔

32- ہوا میں وہ جگنو کی طرح چمک رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چاند کا جلوہ قدموں میں اتر آیا ہے۔

33- فقط میں چاندنی میں طور کہاں ہے۔ یہ تو اس کے حسن کا کمال ہے جس نے چاندنی کو یہ طرہ بخش دیا ہے کہ وہ بھی نظروں کو حسن اور سکون بخش رہی ہے۔

34- زمانہ اور ہوا سبھی چمک رہیں۔ زمین سے آسمان تک بس نور ہی نور پھیلا ہوا ہے۔

35- پھول اور غنچے سبھی مدہوش ہیں، زمین دلہن بنی ہوئی ہے پوری طرح سچی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

36- سبھی حسینائیں زرفت پہنے ہوئے ناز و ادا کے ساتھ چل رہی ہیں۔ جنہیں سورج اور چاند بھی دیکھ لیں تو غش کھا کر گر جائیں۔

37- نم گیر کے لفظی معنی نمی کو جذب کرنے والا ہوتا ہے۔ نم گیر بھی ایسا جس پر سونے یا سنہری تاروں جس پر سونے کا رنگ جھلکتا ہو وہ لگا ہوا ہے۔ اس کے جھالروں میں موتیوں نے اور بھی خوبصورتی پیدا کر دی ہے۔ یعنی نم گیر پر جو موتی ٹانگے گئے ہیں وہ بھی اس کی چمک دھمک پر قربان ہو رہے ہیں۔

38- الماس کے جڑاوا ایک الگ ہی نظارہ پیش کر رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔

39- ہر جانب سونے کی تار کی ڈوریاں کھنچی ہوئی ہیں اور کناروں پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہار کی لڑیاں لگی ہوئی۔

40- جھالر کی پھبن کو بیان کرنا بہت مشکل ہے ایسا لگتا ہے جیسے جھالر کے بجائے سورج اس کے گردن کے گرد جمائل ہو گیا ہے۔ یعنی جھالر کی چمک سورج کی روشنی کو ماند کر رہی ہے۔

41- باغ میں جو مسند لگی ہوئی ہے وہ بھی جگمگ رہی اور اس کے قدموں میں لگتا ہے جیسے چاندنی بچھا دی گئی ہے۔ روشنی نے ایسا سماں بنایا ہے کہ ہر طرف چاندنی کا گمان ہو رہا ہے۔

42- مسند پر رکھے بھی خوش ہیں کیونکہ سارا حسن ان کے ارد گرد موجود ہے۔

- 43- شیشے کی صراحیوں اور جام بلور کا دور چل رہا ہے۔ دل اور نگاہ فقط نور کا تماشا بنی بنا ہوا ہے۔
- 44- زمین پر ہر جانب نور پھیلا ہوا ہے اور آسمان بھی نور کا منظر پیش کر رہا ہے۔ یعنی جس جانب بھی نظر جائے بس نور ہی نور پھیلا ہوا ہے۔
- 45- باغ میں ہر جانب خوش الحان، سرور بخشنے والے ترانے گانے والے بھرے ہوئے ہیں۔ ہر جگہ جوانوں کا ریلا ہے۔
- 46- محبوب مہتاب کی مانند چمک رہا ہے اور اس کے ارد گرد ستارے ایسے لگ رہے ہیں جیسے پانی میں سفید چونے کے قطرے ہوں۔
- 47- باغ کی فضا پر نگاہ ڈالیں تو وہاں بھی مہر و ماہ کے سایے نظر آ رہے ہیں۔ چاند سورج زمین پر اتر آئے ہیں اور باغ کو روشنی بخشنے کے لیے اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں۔
- 48- جس جانب بھی نگاہ کریں نور کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔
- 49- حسن کا انتخاب بہت مشکل امر ہو گیا ہے۔ جس جانب بھی نظر جا رہی ہے ہر آئینے میں اسی ماہتاب کا چہرہ نظر آ رہا ہے۔
- 50- جس جانب بھی نظر کریں، دو اور نزدیک بس اسی چاند کا ظہور ہے۔ اس کے حسن کے سامنے سبھی حسین کم تر نظر آ رہے ہیں۔
- 51- اپنے اکیلے پن سے نکل کر اب کثرت میں آنے کا وقت آ گیا ہے۔ کیونکہ ایک ہی نور ہر جگہ جلوہ نما ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تنہائی سے نکل کر اس کی قربت حاصل کی جائے۔
- 52- نئے رنگ روپ سے ہر جانب ماہتاب نے روشنی پھیلا رہی ہے۔ محبوب کتاب کی مانند اپنی روشنی سے ہر ایک کو منور کر رہا ہے۔
- 53- حقیقت میں اسی دیکھنے کے لیے اس بصارت کی ضرورت ہے جو یکسوئی اور وحدت کی قائل ہو۔ اس کے سوا کسی غیر کو دیکھنے کے بارے میں خیال بھی نہ آئے یہی دراصل محبوب کیلئے اعتراف محبت ہے۔

THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

حاصل مطالعہ:

مثنوی سحرالبیان ایک عشقیہ مثنوی ہے جس میں شہزادہ بے نظیر اور شہزادی بدر منیر کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ سحرالبیان کے قصے میں کوئی جدت نہیں ہے البتہ میر حسن نے اس عہد کی تصویر کشی اور معاشرت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ کردار نگاری میں میر حسن کو کافی مہارت ہے۔ اس مثنوی میں بہت سے کردار اہم اور قابل تعریف ہیں۔ نجم النساء کا کردار ان سب میں سب سے زیادہ جاندار اور دلکش معلوم ہوتا ہے۔ جذبات نگاری میں میر حسن نے خصوصی توجہ دی ہے۔ مکالمے ایسے فطری انداز میں ادا کیے گئے ہیں کہ ان سے کرداروں میں جان پڑ گئی ہے۔ میر حسن نے مثنوی کے اجزاء مختلف قصوں اور داستانوں سے لیے ہیں مگر انہیں اس حسن و خوبی سے ایک دوسرے میں پیوست کیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے ہیں۔ انہوں نے ہر جگہ توازن کا خاص خیال رکھا ہے جس کی وجہ سے پلاٹ نہایت مربوط معلوم ہوتا ہے۔ مافوق الفطرت مناظر کی پیشکش وقت کی ضرورت تھی یہی اس دور کا چلن تھا۔ تاہم انسانی زندگی کی جتنی تصویریں اس مثنوی میں پیش کی گئی ہیں وہ سب فطری ہیں۔ مثنوی میں اس عہد کی تہذیب و معاشرت، رہن سہن، رسم و رواج ہر چیز اصل شکل میں

دکھائی گئی ہے اس طرح سے منظر کشی کے تناظر میں یہ مثنوی اپنے عہد کا عکاس بن گئی ہے۔

آپ نے کیا سیکھا؟

- میر حسن کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل ہوئی
- سحرالبیان سے متعلق مکمل آگاہی ہوئی
- کردار نگاری، منظر نگاری، جزئیات نگاری اور اصل قصے کو سمجھنے میں مدد ملی
- لکھنوی تہذیب و معاشرت کو سمجھنے میں مدد ملی
- سحرالبیان کے متن اور زبان و بیان سے واقفیت حاصل ہوئی

اپنا امتحان خود لیجیے

- میر حسن کی مثنوی نگاری پر ایک نوٹ لکھیں؟
- سحرالبیان کے تناظر میں میر حسن کے زبان و بیان کو مثالوں سے واضح کریں؟
- سحرالبیان کے کردار، مناظر اور جزئیات سے بحث کریں؟

کتب برائے مطالعہ

- اردو مثنوی شمالی ہند میں ڈاکٹر گیان چند جین
- اردو مثنوی کا ارتقا عبدالقادر سروری
- مثنوی سحرالبیان میر حسن (اتر پردیش اردو اکادمی)

☆☆☆



ignou
THE PEOPLE'S
UNIVERSITY

اکائی 17 پنڈت دیاشنکر نسیم: حیات، مثنوی نگاری اور متن کی تدریس (آوارہ ہونا بکاو؟ لی کا تاج الملوک گل چیس کی تلاش میں)

ساخت

اغراض و مقاصد

تمہید

پنڈت دیاشنکر نسیم: حیات، مثنوی نگاری

• حیات و خدمات

• مثنوی نگاری

• مثنوی گلزار نسیم

• متن کی تشریح

حاصل مطالعہ

آپ نے کیا سیکھا

اپنا امتحان خود لیجیے

کتب برائے مطالعہ

اغراض و مقاصد:

• پنڈت دیاشنکر نسیم حیات و خدمات سے تعارف

• مثنوی گلزار نسیم سے مکمل واقفیت

تمہید:

داستانی قصے اور اساطیری روایتیں دراصل ہند ایرانی تہذیبی روایت کا حصہ ہیں۔ گل بکاو؟ لی کا قصہ اصلاً ہندوستانی ہے، مگر اس میں مختلف کہانیوں کے عناصر ملتے ہیں۔ یعنی اس چھوٹی سی داستان میں ہند ایرانی مشترکہ تہذیبی و مذہبی روایتوں کے عکس جگہ جگہ ملتے ہیں۔ گل کرسٹ کی فرمائش پر مٹی نہال چند لاہوری نے اس فارسی قصے کا اردو نثر میں 1803ء میں ترجمہ کیا۔ پھر 1844ء میں پنڈت دیاشنکر نسیم لکھنوی نے اسے نظم کیا۔ مثنوی حقیقت میں ایک سرگذشت یا

بیان ماجرا ہے۔ مثنوی اس بات کا تقاضہ کرتی ہے اس کی زبان اور بیان کی سطح میں سلاست اور روانی کو پیش نظر رکھا جائے تاکہ قاری کی دلچسپی کسی بھی طور سے کم نہ ہو اور وہ اس کی گرفت سے باہر نہ نکل سکے۔

یہ داستان اردو کی دیگر رومانی مثنوی کی داستانوں کی بہ نسبت پیچیدہ ہے۔ چون کہ تمام قصہ فرضی، خیالی اور طلسماتی ہے اس لیے پنڈت دیانند کشنکر نے الفاظ کا انتخاب، طرز بیان، رعایت لفظی اور دیگر صنائع و بدائع کا خوب استعمال کیا ہے۔ جہاں تفصیل دی جاسکتی تھی وہاں اختصار سے کام لیا اور جہاں اشارات سے کام چل سکتا تھا وہاں داستان کو پھیلا دیا گیا ہے۔

مثنوی میں شہزادہ تاج الملوک کی پرستان میں ان مہمات کا ذکر ہے جہاں وہ گل بکاؤ؟ لی کی تلاش میں گیا تھا۔ ایک سرمہ ساز نے بتایا کہ گل بکاؤ؟ لی مس کرنے سے ناپینا باپ کی آنکھوں میں روشنی واپس آجائے گی۔ اس مہم میں تاج الملوک بکاؤ؟ لی (پری) کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ بکاؤ لی کو خواب تھی تب ہی ان نے پھول بھی چرا لیا اور اس سے گشتی بھی بدل لی۔ بکاؤ لی مرد کا بھیس بدل کر تاج الملوک کو تلاش کر لیتی ہے۔ بکاؤ لی کی ماں رقیب کا کردار ادا کرتی ہے اور دونوں کو جدا کر دیتی ہے۔ طلسماتی جنگلوں میں کئی معرکوں کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور شادی کر لیتے ہیں۔ داستان یہاں ایک دوسرا موڑ لیتی ہے۔ راجہ اندر دربار میں بکاؤ لی کو طلب کر کے سزا کے طور پر اس کا آدھا دھڑ پتھر کا بنا کر قید کر دیتے ہیں۔ اس درمیان میں راجہ اندر کی بیٹی شہزادی چتراوت، تاج الملوک سے عشق کرے لگتی ہے اور یہ معلوم کر کے کہ وہ بکاؤ لی کا عاشق ہے اور اس کی طرف مائل نہ ہوگا۔ بکاؤ لی کو آزاد کرانے میں وہ شہزادے کی مدد کرنے لگتی ہے۔ حالات کچھ یوں بنتے ہیں کہ بکاؤ لی کو دوسری زندگی عطا کی جاتی ہے اور وہ سترہ برس کے بعد شہزادہ سے مل جاتی ہے۔ اس داستان کے اندر ایک اور داستان وزیر کے بیٹے بہرام اور حسن آرا کے عشق کی بھی ہے۔

اس پیچیدہ پلاٹ کو نظم کرنے کے لیے پنڈت دیانند کشنکر نے جس بحر کا انتخاب کیا اس کو ٹھہر ٹھہر کر ہی پڑھا جاسکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ انہوں نے یہ بحر دانستہ طور پر منتخب کیا ہو کہ لوگ دھیرے دھیرے الفاظ پر غور کر کے پڑھیں اور اس کے محاسن لفظی کا پورا لطف اٹھاسکیں۔ گلزار نسیم میں خاص لکھنؤی ماحول کی عکاسی کی گئی ہے۔ نوابی ماحول میں عورتوں کو مردوں پر برتری حاصل تھی اسی وجہ سے بہت سے نسوانی کردار داستان پر حاوی ہیں۔ لکھنؤ کے عیش پرستانہ ماحول نے بھی کچھ آزادیاں عطا کیں۔ اسی وجہ سے پنڈت دیانند کشنکر نے بھی ایسا کوئی موقع نہیں چھوڑا جس میں لطف لے لے کر عریاں مناظر بیان نہ کئے ہوں۔ مختصر نویسی اس مثنوی کی صفت ہے۔ رعایت لفظی اور انتخاب الفاظ میں اس مثنوی کا کوئی جواب نہیں۔ مثنوی کی ساخت یوں رکھی گئی ہے کہ پہلے حمد پھر نعت رسول اور پھر مناقب آل محمد اور اس کے بعد مناسب گریز کر کے اصل قصہ شروع کیا گیا ہے۔

پنڈت دیانند کشنکر نے حیات:

پنڈت دیانند کشنکر نے 1811ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا تعلق پنڈتوں کے معزز اور تعلیم یافتہ خاندان سے تھا اس لیے ان کو بھی ادبیات سے بے حد دلچسپی تھی۔ ضروری تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ شاہی فوج میں کلرک ہو گئے تھے اور غالباً شعبہ مالیات کا حساب کتاب رکھتے تھے۔ یہ غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر نوابین اودھ کا دور تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ اپنی آسودہ حالی اور تعیشات میں مست تھا۔ نسیم نے اپنے ادبی ذوق کی تسکین خواجہ حیدر علی آتش کے آگے زانوئے ادب تہہ کر کے حاصل کی۔ آتش کا مرتبہ ان بزرگ اساتذہ میں نمایاں ہے جنہوں نے اردو زبان کی اصلاح، صفائی اور محاورہ بندی کا کام نہایت خوبی سے کیا اور اپنے اپنے اس کام میں شاگردوں کو شریک کر کے اصلاح زبان کے کام کی تسلسل کو جاری رکھا۔ ان کے کم و بیش تمام شاگردوں نے آگے چل کر ایک خاص طرز کلام میں نام حاصل کیا۔ پنڈت دیانند نے بھی حسب رواج شروع میں غزلوں پر طبع آزمائی کی تھی۔ ان کی غزلوں سے چند

مثالیس:

عشق میں دل بن کے دیوانہ چلا
آشنا سے ہو کے بیگانہ چلا

جب ہو چکی شراب تو میں مست مر گیا
شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

اشک ٹپکے حال دل کا کھل گیا
دید؟ گریاں سے پردہ کھل گیا

میں بوسہ لوں گا بہانے بتائیے نہ مجھے
جو دل لیا ہے تو قیمت دلائیے نہ مجھے

چاندنی ہر شب کو کرتی ہے کنار چاندنی
تیرے خاطر منہ کو دکھلاتی ہے تارا چاندنی

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی
کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی

بتوں کی اگر خود نمائی نہ دیکھوں
ان آنکھوں سے یارب خدائی نہ دیکھوں

دل سے ہر دم ہمیں آواز لگا آتی ہے
بندکانوں کو بھی گریہ کی صدا آتی ہے

نقاب چہرہ سے وہ شعلہ رواٹھالیتا
تو چشم بد کو میں آنکھوں کا تل جلا لیتا

گزر اچھاں سے میں تو کہا ہنس کے یار نے
قضیہ گیا فساد گیا دوسر گیا

لائے اس بت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

پنڈت دیا شنکر نسیم کے حالات زندگی زیادہ تر نظروں سے اوجھل ہیں۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

نسیم کے مفصل حالات زندگی معلوم نہیں۔ اوروں سے کیا شکایت خود چکبست نے اس سلسلے میں نہ لکھنے کے برابر لکھا ہے۔ پنڈت دیا شنکر کول نسلاً کشمیری پنڈت تھے، والد کا نام تھا پنڈت گنگا پرشاد کول، وطن لکھنؤ تھا، نسیم تخلص تھا اور آتش کے شاگرد تھے۔ چکبست سے پہلے کلب علی خاں نادر یہ باتیں لکھ چکے تھے: نسیم، پنڈت دیا شنکر، اہل خطہ، ولد گنگا پرشاد، ساکن لکھنؤ، صاحب مثنوی گلزار نسیم، شاگرد خواجہ حیدر علی آتش۔ (مثنوی گلزار نسیم، تدوین: رشید حسن خاں، صفحہ

(54)

رشید حسن خاں نے دیا شنکر نسیم کی زندگی پر دلائل کے ساتھ بحث کی ہے۔ ولادت کی تاریخ میں اختلاف نہیں ہے لیکن یوم وفات پر مختلف اقوال ملتے ہیں۔ چکبست کے مختلف اقوال اس تضاد کی بنیاد بنتے ہیں۔ رشید حسن خاں کے مطابق نسیم کا سال وفات 1261ھ مطابق 1845ء ہے۔ مثنوی گلزار نسیم:

مثنوی گلزار نسیم پہلی بار 1844ء میں لکھنؤ؟ کے مطبع حسنی میر حسن رضوی میں چھپی۔ مثنوی گلزار نسیم پنڈت دیا شنکر نسیم کی وہ مثنوی ہے جس نے انہیں حیات جاوید عطا کی اور یہی وہ مثنوی ہے جسے لکھنؤ کے دبستان شاعری کی پہلی طویل نظم کا شرف حاصل ہے۔ یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے جو قصہ؟ گل بکاو؟ لی کے نام سے مشہور ہے۔ گلزار نسیم میں تشبیہ اور استعارات کا خوبصورت استعمال ہوا ہے، مثنوی کے پہلے شعر سے لے کر آخری شعر تک تو اتر کے ساتھ یہ انداز بیان برقرار رہتا ہے اور اس طرح گلزار نسیم لکھنوی تہذیب کی ترجمان بن جاتی ہے۔ گلزار نسیم میں نوابین اودھ کے عہد کی تہذیب نظر آتی ہے۔ گلزار نسیم کی ایک خصوصیت اس کے پلاٹ کی پیچیدگی ہے۔ یہ صرف تاج الملوک اور بکاؤلی یا پھر صرف ایک پھول حاصل کرنے کی کہانی نہیں ہے بلکہ اس میں کئی کہانیاں شامل ہو گئی ہیں۔ اس نسخہ کو رشید حسن خاں نے مرتب کیا ہے۔ اردو میں دو ہی مثنویوں نے بے پناہ شہرت حاصل کی۔ ایک میر حسن کی مثنوی سحر البیان اور دوسری پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم۔ سحر البیان میں سادگی کا حسن ہے اور گلزار نسیم میں پرکاری کا جادو ہے۔ دیا شنکر نسیم حیدر علی آتش کے شاگرد تھے۔ اس مثنوی کی تصنیف کے دوران شاگرد کو قدم قدم پر استاد کی رہنمائی حاصل رہی۔ آتش کی ہدایت پر ہی نسیم نے مثنوی کو مختصر کر کے نئے سرے سے لکھا اور ایجاز و اختصار سے بھرپور ایک مکمل تخلیق پیش کر کے ادب میں لازوال ہو گئے۔

گلزار نسیم کا پلاٹ:

ایک بادشاہ جس کا نام زین الملوک ہے اس کے چار بیٹے تھے۔ کچھ عرصہ بعد پانچواں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام تاج الملوک رکھا گیا۔ اس بیٹے کے بارے میں نجومیوں نے پیش گوئی کی کہ اگر بادشاہ کی نظر اس پر پڑی تو وہ بینائی سے محروم جائے ہوگا اور ایک دن ایسا ہوا اور نجومیوں کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔

بادشاہ کا علاج یہ تجویز کیا گیا کہ ایک پھول جسے گل بکا ولی کہنا م سے جانا جاتا ہے اس کے ذریعہ بادشاہ اپنی کھوئی ہوئی بینائی دوبارہ حاصل کر سکتا ہے۔
دراصل اسی پلاٹ کے ارد گرد قصبے بنتے گئے اور ایک مکمل خاکہ تیار ہو کر گلزار نسیم کی صورت میں سامنے آیا۔

معاشرت کی تصویر کشی:

اگرچہ گلزار نسیم کا پلاٹ مکمل طور پر فرضی ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ شاعر اپنے عہد سے پوری طرح متاثر ہوتا ہے۔ گلزار نسیم میں نوابین اودھ کے عہد کی تہذیب نظر آتی ہے۔ پنڈت دیانند نسیم نے نواب غازی الدین حیدر، نواب نصیر الدین حیدر، نواب محمد علی شاہ، نواب امجد علی شاہ کا زمانہ دیکھا تھا۔ اس لئے اس عہد میں لکھنویوں میں جو رسم و رواج عام تھے ان کی جھلک گلزار نسیم میں نظر آتی ہے۔ مرصع کاری میں گلزار نسیم اپنی مثال آپ ہے اس کے لکھنے والے پنڈت دیانند نسیم، خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد تھے اور خود آتش کے خیال میں شاعری مرصع ساز کا کام ہے چنانچہ بندش الفاظ نگوں کے جڑنے کی طرح ہیں۔ دیانند نسیم نے بھی بندش الفاظ کے معاملے میں اپنے استاد جیسی فنی مہارت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ دیانند نسیم کی اس مثنوی میں اس مرصع سازی کے نمونے جگہ جگہ بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔

دیانند نسیم کو منظر نگاری پر پورا عبور حاصل ہے لیکن مثنوی کو مختصر کرنے کے سلسلے میں بعض جگہوں پر اس کی کمی نظر آنے لگتی ہے یقینی طور پر اگر وہ اپنی مثنوی کو پوری طوالت کے ساتھ پیش کرتے تو ایسا نہ ہوتا۔ اس کے باوجود گلزار نسیم میں عمدہ منظر نگاری کے نمونے موجود ہیں۔ یہ نمونے مناظر میں بھی ہیں اور کیفیات میں بھی۔

اک جنگل میں جا پڑا جہاں گرد

صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد

سائے کو پتہ نہ تھا شجر کا

عناق تھا نام جانور کا

شب کو جنگل میں سانپوں کے اوس چاٹے کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:

لہر لہر کے اوس چاٹے

بن میں کالوں نے رات کاٹی

راجہ جب لونڈیوں سے سوال کرتا ہے:

پوچھا پریوں سے کچھ خبر ہے

شہزادی بکا و؟ لی کدھر ہے

تو لونڈیوں کی طرف سے مناسب جواب نہ سو جھنے پر کیا کیفیت ہوئی اس کا منظر ملاحظہ ہو:

آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی

منہ پھیر کے ایک مسکرائی

چتون کو ملا کے رہ گئی ایک

ہونٹوں کو ہلا کے رہ گئی ایک

اس سلسلے میں ایک اور دلچسپ منظر وہ ہے جب تاج الملوک پریوں کے کپڑے چر لیتا ہے اور وہ شرمائی شرمائی بدن کو چراتی آگے بڑھتی ہیں، یہ منظر دیکھیں:

جب خوب وہ شعلہ رو نہائیں

باہر بصد آب و تاب آئیں

پوشاک دھری ہوئی نہ پائی

جانا کہ حریف نے اڑائی

جھک جھک کے بدن چراتی آئیں

رک رک کے قدم اٹھاتی آئیں

کیفیت کی منظر نگاری دیکھیں بکاو؟ لی کی فراق میں حالت یوں بیان کی ہے:

سنسان وہ دم بخود تھی رہتی

کچھ کہتی تو ضبط سے تھی کہتی

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں

آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں

جذبات نگاری:

پینڈت دیاشنکر کرم کو جذبات نگاری میں ید طولی حاصل ہے انہوں نے مختلف کرداروں کی جذبات کی عکاسی نہایت خوبی کے ساتھ کی ہے مثلاً جب بکاو؟ لی کا پھول غائب ہوتا ہے تو گھبرا کر کہتی ہے۔

منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی

پر آب وہ چشم حوض پائی

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے

کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے

گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل؟

جھنجھلائی کہ کون دے گیا جل؟

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون؟

ہے ہے مجھے خار دے گیا کون؟

ان اشعار میں بکاو؟ لی کی جذبات کی صحیح عکاسی کی گئی ہے۔ بکاو؟ لی کا گھبرانا اور افسوس کرنا بالکل فطری ہے اس لئے ان کے جذبات میں صداقت موجود ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ بکاو؟ لی کی ماں نے جب تاج الملوک کے ساتھ اس کو اختلاط میں پایا تو اس کو سخت غصہ آیا۔ اس نے اپنے غصے کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

حرمت میں لگایا داغ تو نے
 لٹوائی بہار باغ تو نے
 تھمتا نہیں غصہ تھامنے سے
 چل دور ہو میرے سامنے سے

غرضیکہ گلزار نسیم میں مختلف مقامات پر جذبات نگاری کی صحیح اور حسین تصویریں ملتی ہیں۔

جزئیات نگاری:

پنڈت دیا شنکر نسیم نے مختلف واقعات کو موقع و محل کے اعتبار سے پیش کیا۔ اس لئے اس میں بلاغت کی شان پیدا ہو گئی ہے مثلاً جب چاروں شہزادے گل بکا ولی لے کر آئے تو اس کی مدد سے زین الملوک کی آنکھوں میں دوبارہ روشنی واپس آگئی اس وقت بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس نے جشن آراستہ کیا۔ اس واقعے کو نسیم صاحب نے ان اشعار میں بیان کیا ہے۔

گل لائے جو نور دیدہ دل خواہ
 آنکھوں کی طرح پھڑک گیا شاہ
 پنچے سے پلک کے پھول اٹھایا
 اندھے نے گل آنکھوں سے لگایا
 نور آ گیا چشم آرزو میں
 آیا پھر آب رفتہ جو میں

نسیم نے تاج الملوک اور زین الملوک کی ملاقات کا واقعہ مندرجہ ذیل اشعار میں بیان کیا ہے۔
 دونوں میں ہوئیں چار آنکھیں
 دولت کی کھلی ہزار آنکھیں

راجا نے ایک روز بکا و؟ کی کو اپنی محفل میں یاد کیا کیونکہ وہ ایک عرصہ سے غیر حاضر تھی نسیم نے اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے۔

ایک شب راجا تھا محفل آرا
 یاد آئی بکا ولی دل آرا
 پوچھا پر یوں سے کچھ خبر ہے
 شہزادی بکا ولی کدھر ہے
 مکالمہ نگاری:

گلزار نسیم میں کئی مقامات پر مکالمے بھی ملتے ہیں، اگرچہ مثنوی میں یہ ایک مشکل کام ہے۔ چلتی ہوئی کہانی کے بہاؤ؟ میں مکالمے کو برتنا یقینی طور پر مشکل کام ہے۔ لیکن دیا شنکر نسیم نے قصے میں کئی جگہ اپنے فنی کمال کا ثبوت دیتے ہوئے مکالمے پیش کئے ہیں۔

راجانے بکاو؟ لی کے متعلق پوچھا تو پریوں نے خاموشی اختیار کی، اصرار پر بتایا کہ:

ناتا پریوں سے اس نے توڑا

رشتہ ایک آدمی سے جوڑا

وہ سن کے خفا ہوا کہا جاو

جس طرح سے بیٹھی ہوا ٹھالاو

ما فوق الفطرت عناصر:

قدیم دور کی مثنویوں کا ایک نمایاں عنصر ما فوق الفطرت عناصر کا بیان ہے۔ یہ عناصر ان مثنویوں میں خاص طور سے داخل ہو جاتے ہیں جن کے پلاٹ فرضی ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ تاریخی واقعات کے پابند نہیں ہوتے ہیں چنانچہ یہ عناصر سحر البیان میں بھی موجود ہیں اور گلزار نسیم میں بھی۔ مگر گلزار نسیم میں یہ عناصر زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

ڈرامائی عناصر:

گلزار نسیم میں جا بجا ڈرامائی عناصر موجود ہے۔ اس مثنوی میں جو مکالمے پیش کئے ہیں وہ ڈرامہ نگاری کی شان پیدا کر دیتے ہیں۔ جب روح افزاء رہا ہو کر آئی تو جمیلہ اور بکاو لی اس سے ملنے گئیں اور اس کا حال پوچھا۔ نسیم نے اس موقع پر یوں مکالمہ پیش کیا ہے:

روح افزاء سے ہوئیں بغلیگر

صورت پوچھی کہا کہ تقدیر

تاج الملوک دلبر بیسوا سے رخصت ہو رہا ہے اس موقع کی تصویر نسیم نے یوں کھینچی ہے:

یہ کہہ کے اٹھا کہا کہ لوجان

جاتے ہیں، کہا خدا نگہ بان

کردار نگاری:

یورپ کا بادشاہ زین العابدین، پانچواں بیٹا تاج الملوک، دلبر نامی بیسوا، دیو، جمالہ دیونی (دیو کی بہن)، جمالہ کے پاس محمودہ نامی آدم زاد لڑکی، نابینا جوگی، بکاو؟ لی مردانہ لباس پہن کر فرخ وزیر بنی، بکاو؟ لی کی ماں جمیلہ، روح افزا پری، روح افزا کی ماں حسن آرا، راجہ اندر، چتراوت، سراندیپ (سنگلدیپ) کی رانی، تاج الملوک کے وزیر کا بیٹا، بہرام، دلبر بیسوا کا غلام ساعد۔

مثنوی گلزار نسیم کے سارے کردار اگرچہ بڑی حد تک مصنوعی اور بناوٹی ہیں تاہم ان کرداروں کی کچھ نمایاں خصوصیات ہیں جن کی بنیاد پر ان کو زیادہ بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

تاج المملوک: مثنوی گلزار نسیم کا ہیر و تاج المملوک ہے اس کے گرد ساری مثنوی کے واقعات گردش کرتے ہیں، مگر تاج المملوک ایک بد قسمت شہزادہ ہے کیونکہ اس پر جب باپ کی نظر پڑتی ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے یوں اسے ملک بدر کیا جاتا ہے۔ نسیم نے اس بات کو یوں بیان کیا ہے:

صاد آنکھوں کے دیکھ کے پسر کی

بینائی کے چہرے پر نظر کی

مہربانہ ہوئی خموشی

کی نور بصر سے چشمک پوشی

تاج المملوک ایک حساس اور فرض شناس انسان ہے جب بادشاہ کی بینائی جاتی رہی تو چاروں شہزادے گل بکاو؟ لی کے پیچھے روانہ ہوئے۔ اس وقت تاج المملوک نے بھی اسے اپنا فرض سمجھا اور گل بکاو؟ لی کی تلاش میں روانہ ہوا۔ تاج المملوک ایک ذہین شہزادہ تھا اس کے مقابلے میں چاروں بھائی بے وقوف اور کم عقل تھے۔ تاج المملوک بہت موقع شناس تھا۔ جب تلاش گل بکاو؟ لی میں سلطنت ارم کی سرحد تک پہنچا تو سرحد کا دیوانہ نہیں کھانے کو دوڑا۔ لیکن اسی اثناء میں وہاں سے کچھ اونٹوں کا گزر ہوا۔ جن پر سامان خورد و نوش لدا ہوا تھا۔ جن ان کو کچا کھانا چاہتا تھا لیکن تاج المملوک کے ذہن میں آیا کہ اس کو پکا کر کھلایا جائے تو یہ خوش ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے حلوہ پکایا۔ تاج المملوک نے موقع سے فائدہ اٹھایا، اور اس سے کہا مجھے گل بکاو؟ لی کی تلاش ہے۔ اس کے علاوہ تاج المملوک بہت حوصلہ مند اور باہمت نوجوان تھا اس نے گل بکاو؟ لی حاصل کرنے کے لئے بے شمار مصائب اٹھائے مگر ہمت نہیں ہاری۔ جب اسکے بھائیوں نے دھوکے سے اس سے گل بکاو؟ لی چھین لی تو اس نے ہمت نہیں ہاری اور ثابت قدمی سے حالات کا مقابلہ کیا اور آخر میں ان کو اس کا صلہ بھی ملا۔ غرضیکہ تاج المملوک میں بے پناہ خوبیاں ہیں وہ ساری مثنوی پر چھایا ہوا ہے۔

بکاو؟ لی: مثنوی گلزار نسیم کی ہیر و تاج المملوک ہے۔ اس مثنوی میں دوسرا کردار اسی کا ہے۔ بکاو؟ لی ایک پری ہے اس کا حسن چار دانگ عالم میں مشہور ہے۔ جب تاج المملوک اس کی خواب گاہ میں پہنچتا ہے تو وہ اس کے حسن کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔

پردہ جو حجاب سا اٹھایا

آرام میں اس پری کو پایا

بند اس کی وہ چشم ز گسی تھی

چھاتی کچھ کچھ کھلی ہوئی تھی

سمٹی تھی جو محرم اس قمر کی

برجوں پہ سے چاندنی تھی سر کی

لپٹے تھے جو بال کروٹوں میں

بل کھا گئی تھی کمر لٹوں میں

سوچا کہ یہ زلف کف میں لین

ہے سانپ کے منہ میں انگلی دینی

بکاو؟ لی کی خوبی یہ ہے کہ وہ ذہین و ہوشیار ہے جب اس کا پھول چرایا گیا تو وہ اس کی تلاش میں گھر سے نکلی۔ آخر کار زین المملوک کے شہر میں داخل ہو گئی۔ بادشاہ کے پوچھنے پر اس نے خود کو فرخ اور باپ کا نام فیروز بتایا۔ بادشاہ نے اسے شہزادہ جان کر اپنا وزیر بنا لیا۔ بکاو لی ایک وفادار بیوی بھی ہے۔ جب زین

الملوک وطن روانہ ہو رہا تھا تو بکاو؟ لی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے اس کے ہمراہ جانے کے لئے تیار ہوگئی انہوں نے والدین سے اجازت چاہی۔

پر دیسیوں سے جو کی ہے نسبت

اب کیجئے ہنسی خوشی سے رخصت

دعویٰ انہیں کچھ دیئے ہوئے پر

قائم رہیے کیے ہوئے پر

بکاو؟ لی آخر وقت تک تاج الملوک کو نہیں بھولی اور آخر وقت تک تاج الملوک کا ساتھ دیا۔ جب اس نے دہقان کے گھر میں دوبارہ جنم لیا تب اس نے تاج

الملوک سے دوبارہ شادی کی۔ غرضیکہ بکاو؟ لی اپنے حسن، عقلمندی اور وفاداری کی بنا پر ایک کامیاب ہیروئن نظر آتی ہے۔

مثنوی گلزار نسیم کا اسلوب:

گلزار نسیم، سحرالبیان کے تقریباً نصف صدی بعد لکھی گئی اس وقت تک لکھنوی معاشرہ ایک واضح شکل اختیار کر چکا تھا۔ اب زندگی کے لوازمات میں ہی نہیں بلکہ طرز فکر اور طرز گفتار میں بھی تکلف اور رنگینی آگئی تھی۔ چنانچہ گلزار نسیم پڑھتے ہوئے قدم قدم پر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کی زبان اور اسلوب وہ نہیں جو نصف صدی پہلے میر حسن نے اختیار کی تھی۔ میر حسن کے انداز نگارش میں دہلوی اور لکھنوی دونوں دبستانوں کی آمیزش ہے۔ جبکہ گلزار نسیم خالصتاً لکھنوی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ سحرالبیان کے بنیادی اوصاف صفائی، زبان، لطف، محاورہ، جذبات نگاری، منظر نگاری اور منظر کشی تھے۔ لیکن نسیم کے زمانے تک لکھنوی زندگی اس قدر رنگین ہوگئی تھی کہ لوگ تحریر اور تقریر میں تکلف کو لازمی قرار دینے لگے تھے۔ چنانچہ نسیم اور ان کے ہم عصر شعراء کارنگینی اور مرصع کاری کی طرف غالب رجحان ہے۔ نسیم کی اپنی طبیعت میں مرصع کاری اور ذوق جمال کے عناصر موجود تھے۔

رعایت لفظی:

گلزار نسیم کی ایک نمایاں خصوصیت رعایت لفظی ہے۔ اس میں نسیم نے یہ کمال کیا ہے کہ یہ احساس نہیں ہوتا کہ کوئی لفظ دوسرے لفظ سے مناسبت کی وجہ سے

خواہ مخواہ بھردیا گیا ہے۔ رعایت لفظی مشکل صنعت ہے اور اس کا برتنا آسان نہیں، اس سلسلے میں یہ شعر دیکھیں:

سایے کو پتہ نہ تھا شجر کا

عناق تھا نام جانور کا

ہم بستر آدمی پری تھی

سائے کی بغل میں چاندنی تھی

تشبیہ و استعارہ:

پنڈت دیا شکر نسیم نے اس مثنوی میں تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے۔ یہ تشبیہیں اور استعارے نسیم کے اشعار میں کلام کا ایک جزو بن

کراتے ہیں۔ ان کے علاوہ وجود ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔

یوں سچ پہ آ کے سوئی بے تاب

جس شکل سے آئے آنکھ میں خواب

آغوش کی موج سے وہ مضطر
مچھلی سی نکل گئی تڑپ کر

متن کی تدریس و تفہیم:
آوارہ ہونا بکاو؟ لی کا تاج الملوک گل چھیں کی تلاش میں

گل کا جو الم چمن چمن ہے
یوں بلبل خامہ نعرہ زن ہے
گل چھیں نے وہ پھول جب اڑایا
اور غنچے صبح کھل کھلایا
وہ سبزہ باغ خواب آرام
یعنی وہ بکاو لی گل اندام
جاگی مرغ سحر کے غل سے
اٹھی نہت سی فرش گل سے
منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی
پر آب وہ چشم حوض پائی
دیکھا، تو وہ گل ہوا ہوا ہے
کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے

گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل!
جھنجھائی کہ کون دے گیا جل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون!
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہا تھا اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بوہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے

نرگس! تو دکھا کدھر گیا گل؟
 سون! تو بتا کدھر گیا گل؟
 سنبل! مرا تا زیانہ لانا
 شمشاد! انھیں سولی پر چڑھانا
 تھرائیں خواصیں صورت بید
 ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید
 نرگس نے نگاہ بازیاں کیں
 سون نے زباں درازیاں کیں
 پتا بھی پتے کو جب نہ پایا
 کہنے لگیں: کیا ہوا خدایا!

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون
 بیگانہ تھا سبزے کو سوا کون!
 شبنم کے سوا چرانے والا
 اوپر کا تھا کون آنے والا

جس کف میں وہ گل ہو، داغ ہو جائے
 جس گھر میں ہو، گل چراغ ہو جائے

بولی وہ بکا ولی کہ افسوس!
 غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس
 آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا
 تپلی وہی چشم حوض کا تھا
 نام اس کا صبا! نہ لیتی تھی میں
 اس گل کو ہوانہ دیتی تھی میں
 گل چیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا
 غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
 اوخار! پڑا نہ تیرا چنگل
 مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل!

او باد صبا! ہوانہ بتلا

خوش بوہی سنگھا، پتانہ بتلا
 بلبل! تو چہک، اگر خبر ہے
 گل! تو ہی مہک، بتا کہ دھر ہے؟
 لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام
 تھی سبزے سے راست موبر اندام
 انگلی لب جو پپر رکھ کے شمشاد
 تھام بہ خود، اس کی سن کے فریاد
 جو نخل تھا، سوچ میں کھڑا تھا
 جو برگ تھا، ہاتھ مل رہا تھا
 رنگ اس کا عرض لگا بدلنے
 گل برگ سے کف لگی ہو ملنے

بدلے کی انگوٹھی ڈھیلی پائی
 دست آویز اس کے ہاتھ آئی
 خاتم تھی نام کی نشانی
 انسان کی دست برد جانی
 ہاتھوں کو ملا، کہا کہ ہیہات!
 خاتم بھی بدل گیا ہے بد ذات
 جس نے مجھے ہاتھ ہے لگایا
 وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا!
 عریاں مجھے دیکھ کر گیا ہے
 کھال اس کی جو کھینچے، سزا ہے
 یہ کہہ کے، جنون میں غضب ناک
 خوں روئی، لباس کو کیا چاک
 گل کا سا لہو بھرا گریباں
 سبزے کا سا تار تار داماں
 دکھلا کے کہا سمن پری کو
 اب چین کہاں بکا و؟ لی کو

تھی بس کہ غبار سے بھری وہ
 آندھی سی اٹھی، ہوا ہوئی وہ
 کہتی تھی پری کہ اڑ کے جاتی
 گل چیں کا کہیں پتا لگاتی
 ہر بارغ میں پھولتی پھری وہ
 ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ

جس تختے میں مثل باد جاتی
 اس رنگ کے گل کی بونہ پاتی
 بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے!
 پتا کہیں حکم بن ہلا ہے!

تشریح:

عزیز طلبا! ابھی آپ نے پنڈت دیانند کشن کی مثنوی گلزار نسیم کے جن منتخب اشعار کی قرات کی ہے، اس کی تشریح درج ذیل ہے:

پہلے شعر میں بکاو؟ لی کی فرقت کو دکھایا گیا ہے۔ اردو شاعری میں گل اور بلبل استعارے کے طور پر بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ تاج الملوک سے بچھڑنے کے بعد بکاو؟ لی کا غم و الم آفاق کی وسعتوں تک پھیل گیا ہے۔ چمن چمن اس کی درد بھری آواز محسوس ہوتی ہے۔ جس طرح ایک بلبل چہکتی ہے اور اپنی کوک سے دروالم کا ایک منظر پیش کرتی ہے بالکل اسی طرح بکاو؟ لی بھی اپنا غم بیان کر رہی ہے۔ ایسا غم جس میں فراق ہے، سوز ہے اور بے انتہا تڑپ بھی پوشیدہ ہے۔ دوسرے سے لے کر پانچویں شعر تک تاج الملوک کی پھول چرا لینے کے بعد کا واقعہ بیان کیا جا رہا ہے۔ پھول غائب ہو چکا ہے اور بکاو؟ لی کو خبر نہیں ہوئی ہے۔ روزمرہ کی طرح وہ صبح کو بیدار ہوتی ہے۔ وقت صبح جب غنچے کھلے ہوئے ہیں، روشنی ہوگئی ہے تو بکاو؟ لی اپنی خواب گاہ سے باہر آئی اور حوض کے پاس پہنچی۔ ابھی نیم خوابی کی کیفیت میں وہ آنکھوں کو مل رہی ہے یعنی پوری طرح بیداری کی کیفیت نہیں آئی ہے۔

چھٹے سے لے کر آٹھویں شعر تک اس بات کا بیان ہے کہ بکاو؟ لی کی نظر جب حوض پر پڑی تو اس نے دیکھا کہ پھول غائب ہو گیا ہے۔ دوسرے گل تو کھلے ہوئے ہیں لیکن وہ گل جو خاص ہے اور منظور نظر ہے وہی غائب ہو گیا ہے۔ اس کی نیند پوری طرح غائب ہوگئی۔ گھبراہٹ میں وہ پھول ڈھونڈنے لگی اور جھنجھلا کر کہا کہ یہ دھوکا کس نے کیا؟ میرا پھول کون لے کر گیا؟

نو سے لے کر گیارہویں شعر تک بکاو؟ لی پھول غائب ہونے پر پوری طرح بھڑکی۔ اس نے اپنے خدمتگاروں سے کہا کہ اگر اس پر کسی نے ہاتھ صاف نہیں کیا ہے تو کیا وہ خوشبو بن کے اڑ گیا ہے۔ پھول اس طرح ہوا نہیں ہو سکتا ہے ضرور کسی نے اسے چرا لیا ہے۔ بکاو؟ لینے سبھی سے پریشان ہو کر تفتیش کی لیکن

اسے کوئی جواب نہ ملا۔

بارہ سے لے کر پندرہویں شعر تک یہ بتایا گیا ہے کہ بکاو؟ لی کی سبھی خواص جو اس کے ساتھ تھیں گھبرا کر پہلو چرانے لگیں۔ تھرانے کو بید سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بیداریک قسم کی چکدار لکڑی ہے اسی لچک کو تھراہٹ سے تعبیر کیا ہے۔ نرگس، سوسن، سنبل سبھی پریشان ہوئے۔ اپنوں میں سے کسی کے پھول چرانے کا انہیں گمان بھی نہیں ہے۔ باغ میں سبزے کے سوا کوئی بیگانہ ہے نہیں جس پر انہیں چوری کا شک ہو۔

سولہ سے لے کر اٹھارہویں شعر تک اس بات کا بیان ہے کہ جب گل کی کوئی خبر نہ ملی تو آخر کار انہوں نے بد دعائیں دینی شروع کیں۔ جس نے بھی وہ پھول چرایا ہے، جس ہاتھ میں بھی وہ پھول ہو خدا کرے وہ داغ ہو جائے۔ بکاو لی نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا کہ افسوس غفلت کی وجہ سے ایسا نایاب اور قیمتی پھول ہم سے چوری ہو گیا۔

انیس سے لے کر اکیسویں شعر تک گل بکاو لی کی بے چینی کا تذکرہ ہے۔ وہ کہتی ہے کہ یہ پھول مجھے بہت عزیز تھا۔ حوض کی آنکھ کا تارا تو دراصل وہی پھول تھا۔ صبا کو مخاطب کرتے ہوئے بکاو؟ لی کہتی ہے کہ میں اس کا نام زبان پر نہیں آنے دیتی تھی تاکہ کسی کو خبر نہ ہو اور نہ ہی کوئی اس کی خصوصیات سے واقف ہو سکے۔ پھول چرانے والے نے جب گل کو توڑا تو ہائے افسوس کی غنچے نے بھی کوئی شور نہ کیا اور خاموش رہا جس کی وجہ سے کسی کو خبر بھی نہیں ہوئی۔

بائیس سے لے کر چوبیسویں شعر تک بکاو؟ لی پھول کی جدائی میں بے حال ہو رہی ہے۔ ہر کسی سے منتیں کر رہی ہے۔ کانٹوں کو کوس رہی ہے کہ تو نے گل چیں کو زخمی کیوں نہیں کیا۔ سنبل تو نے بھی خبر نہیں لی۔ باد صبا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اے صبا اس کی خوشبو کہیں سے لے آ کیونکہ ابھی ہوا سے زیادہ اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ بلبل اگر تجھے گل کی کوئی خبر ہے تو چہک کر بتا اور پھر غائب ہونے والے پھول کو مخاطب کر کے کہتی ہے کہ گل تو جہاں بھی ہے مہک کر اپنا راز فاش کر دے۔

پچیس سے لے کر اٹھائیسویں شعر تک اس بات کا تذکرہ ہے کہ پھول چوری ہونے کے بعد ہر جگہ کہرام مچا ہوا ہے۔ سبزے، سبھی قسم کے پھول نخل اور برگ و بار سبھی دم بخود ہیں کہ آخر کیا ہو گیا ہے۔ اب پھول کو دوبارہ پالینے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔

انیس سے لے کر اکتیسویں شعر تک یہ بتایا گیا ہے کہ پھول چوری کرنے کے بعد تاج الملوک نے اپنی انگوٹھی سے بکاو؟ لی کی انگوٹھی بدل لی تھی۔ بکاو لی نے جب انگوٹھی پر نظر ڈالی تو وہ ہاتھ میں ڈھیلی نظر آئی۔ اس انگوٹھی سے اسے خبر ہوئی کسی نے اسے خواب گاہ میں بے پردہ دیکھ لیا ہے۔ یہ خاتم اسی بات کی نشانی ہے لیکن اس سے اس چور کا سراغ تو نہیں لگایا جاسکتا۔ کف افسوس ملتے ہوئے بکاو؟ لی نے کہا ایک جانب تو پھول چوری ہوا ہی یہ بد ذات انگوٹھی بھی بدل گئی۔

بئیس سے لے کر پینتیسویں شعر تک بکاو؟ لی غضبناک ہو کر کہتی ہے کہ جس نے بھی مجھے ہاتھ لگایا ہے اگر وہ میرے ہاتھ لگ گیا تو اس کی کھال کھنچا دوں گی۔ مجھے عریاں دیکھنے کی یہ سزا ہوگی۔ جنون کے عالم میں وہ خون کے آنسو روئی، اس نے اپنا لباس چاک کر ڈالا اور دامن کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

چھتیس سے لے کر اکتالیسویں شعر تک سمن پری سے بکاو؟ لی کہتی ہے کہ جب میرا پھول میرے پاس نہیں ہے تو مجھے اب چین کہاں مل پائے گا۔ اسی غضبناک کیفیت میں وہ اٹھ کر چلی جاتی ہے۔ اس نے گل چیں کا پتہ لگانے کا حکم دیا۔ سمن پری نے باغ باغ گھوم کے تفتیش کی لیکن اس کی بو کہیں نہ ملی۔ ابھی منزل مقصود بکاو؟ لی کی قسمت میں نہیں تھی۔ حکم خداوندی کے بغیر تو ایک پتہ نہیں ہلتا۔ ابھی بکاو؟ لی کا تاج الملوک سے ملنا طے نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ اس کی لاکھ کوششوں کے باوجود نہ گل کا پتہ چلا اور نہ ہی گل چیں کا۔

حاصل مطالعہ:

مثنوی گلزار نسیم وہ مثنوی ہے جس نے پنڈت دیاشنکر نسیم کو حیات جاوید عطا کی اور یہی وہ مثنوی ہے جسے لکھنؤ کے دبستان شاعری کی پہلی طویل نظم کا شرف حاصل ہے۔ گلزار نسیم میں تشبیہ اور استعارات کا خوبصورت استعمال ہوا ہے، مثنوی کے پہلے شعر سے لے کر آخری شعر تک تو اتر کے ساتھ یہ انداز بیان برقرار رہتا ہے اور اس طرح یہ لکھنوی تہذیب کی ترجمان بن جاتی ہے۔ گلزار نسیم میں نوابین اودھ کے عہد کی تہذیب نظر آتی ہے۔ دیاشنکر نسیم کی یہ تصنیف الفاظ کی شوکت، بندش کی چستی، ندرت تشبیہات، صنعتوں کے باکمال اور فنکارانہ استعمال، معنی آفرینی، نازک خیال، ایجاز و اختصار اور دیگر دوسری فنی خصوصیات کی وجہ سے ایک شہکار کی حیثیت رکھتی ہے اور بعض خصوصیات میں اپنی ایک انفرادیت اور مثالی مقام قائم کرتی ہے۔ گلزار نسیم کا قصہ گرچہ طبع زادن نہیں ہے لیکن انہوں نے قصے کو نظم کرتے وقت اس میں بے شمار تبدیلیاں کی ہیں کہ وہ ان کا اپنا قصہ بن گیا اور یہ تبدیلیاں اکثر جگہوں پر ایسی ہیں جن سے گلزار نسیم کی فضا بڑی حد تک مانوس ہو گئی ہے۔ گلزار نسیم میں قصے کی فضا کو مجموعی اعتبار سے انسانی فضا سے ہم آہنگ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور سبھی کرداروں کے افعال و اعمال اور جذبات و احساسات حقیقی زندگی کے کرداروں جیسے ہی ہیں۔

آپ نے کیا سیکھا؟

- پنڈت دیاشنکر نسیم کے سوانحی کوائف سے واقفیت حاصل ہوئی
- گلزار نسیم سے متعلق معلومات فراہم ہوئیں
- کردار نگاری، منظر نگاری، جزئیات نگاری اور اصل قصے کو سمجھنے میں مدد ملی
- گلزار نسیم کا متن اور اس کے کلام سے تعارف ہوا

اپنا امتحان خود لیجیے

- پنڈت دیاشنکر نسیم کی مثنوی نگاری پر ایک نوٹ لکھیں؟
- کردار نگاری، منظر نگاری، جزئیات نگاری اور زبان و بیان کو دھیان میں رکھتے ہوئے گلزار نسیم کا جائزہ لیں؟

کتب برائے مطالعہ

- مثنوی گلزار نسیم مرتب: رشید حسن خاں (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ)
- اردو مثنوی شمالی ہند میں ڈاکٹر گیان چند جین
- اردو مثنوی کا ارتقا عبدالقادر سروری

☆☆☆

اکائی نمبر 18 مرزا شوق لکھنوی 'حیات' مثنوی نگاری اور متن کی تدریس (زہر عشق، معشوق کی رخصتی)

ساخت

18.1	اغراض و مقاصد
18.2	تمہید
18.3	مرزا شوق لکھنوی حیات اور کارنامے
18.4	مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی نگاری کا جائزہ
18.5	متن کی تدریس (زہر عشق، معشوق کی رخصتی)
18.6	ماحصل
18.7	آپ نے کیا سیکھا؟
18.8	اپنا امتحان خود لیجیے
18.9	سوالات کے جوابات
18.10	فرہنگ
18.11	کتب برائے مطالعہ

18.1 اغراض و مقاصد

اس اکائی میں آپ

- مرزا شوق لکھنوی کی حیات و خدمات سے واقف ہوں گے
- مرزا شوق کی مثنوی نگاری کی خصوصیات سے متعارف ہوں گے اور
- مرزا شوق کی مثنوی 'زہر عشق' کے ایک حصے 'معشوق کی رخصتی' کا خصوصی مطالعہ کریں گے

18.2 تمہید

مثنوی کا ذکر آتے ہی ہمارے ذہن میں تین مثنویوں کے نام بغیر کسی مشقت کے ابھر آتے ہیں یعنی سحرالبیان، گلزار نسیم اور زہر عشق۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تینوں مثنویوں کا تعلق لکھنؤ دہستان سے ہے۔ ان تینوں مثنویوں میں لکھنؤ کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کی جھلکیاں الگ الگ انداز میں ملتی ہیں۔ کہیں چیزوں کو تفصیل سے بیان کرنے کا رجحان غالب ہے تو کہیں اختصار کے ساتھ رعایتوں کے اہتمام پر خاص زور ہے۔ مرزا شوق لکھنوی نے اپنی

مثنویوں میں لکھنؤ کے روزمرہ اور محاوراتی زبان کے کامیاب استعمال کے ساتھ انسانی جذبات کی کامیاب تصویر کشی کی ہے۔ انھوں نے تین مثنویاں فریب عشق، بہار عشق اور زہر عشق لکھی ہیں اور ان میں عشق کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ لیکن جس مثنوی سے ان کو شہرت و مقبولیت ملی وہ 'زہر عشق' ہے۔ 'زہر عشق' ایک حزن نیا مثنوی ہے۔ آئیے! نواب مرزا شوق کی حیات اور ان کے علمی و ادبی کارناموں سے متعلق ذرا تفصیل سے جانتے ہیں۔

18.3 مرزا شوق لکھنوی حیات اور کارنامے

اردو کے مشہور مثنوی نگار نواب مرزا شوق 6 جنوری 1783 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اصل نام تصدق حسین خان تھا۔ تخلص شوق لکھنوی کرتے تھے اور نواب مرزا کے نام سے مشہور تھے۔ مرزا شوق لکھنوی کا خاندانی پیشہ حکمت و طبابت تھا۔ ان کے بزرگ اودھ کے شاہی درباروں میں بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ ان کے والد آغا علی خان مشہور حکیم تھے۔ شوق کے دادا اور چچا بھی طبابت میں مہارت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نواب مرزا شوق بھی تعلیم کے بعد خاندانی پیشے سے منسلک ہو گئے۔ انھیں نہ صرف شاہی درباروں سے وظیفے ملے بلکہ وہ شاہی طبیب کے اہم عہدے پر بھی فائز ہوئے۔ نواب مرزا شوق سے متعلق ان کے نواسے احسن لکھنوی نے جو تفصیلات بہم پہنچائی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذی علم شخص تھے اور مختلف علوم و فنون پر عبور رکھتے تھے۔ شاعری ان کے لیے تفریحی مشغلے سے زیادہ نہ تھی۔

نواب مرزا شوق بچپن ہی سے ذہین، نازک مزاج، عیش پسند اور نفاست پسند تھے۔ ان کی مثنوی 'فریب عشق' سے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کے بقول وہ بچپن میں اسی کے ساتھ کھیلتے تھے جو حسین ہوتا تھا۔ احباب کی صحبت میں شاعری کا چرچا رہتا تھا۔ کوئی میلا ٹھیلایا تہوار ایسا نہیں تھا کہ جس میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شریک نہ ہوتے ہوں۔ دل لگی کے ساتھ سیر و شکار سے بھی جی بہلایا کرتے تھے۔ لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کی چہل پہل اور رونق کے مراکز یعنی نوچندی، 'کر بلا' حسین آباد کا امام باڑہ اور درگاہ وغیرہ میں پابندی سے جایا کرتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ عاشقی کے فن میں خاصے ماہر ہو گئے تھے اور تماش بینوں کے مرشد کہلاتے تھے۔ اس مثنوی میں خود کو ایک جگہ 'خضر طریق عشق' بھی لکھا ہے۔ عشق بازی کی وجہ سے وہ ایسے مشہور ہو گئے تھے کہ فریب عشق کی ہیروئن سے وہ اپنا تعارف کراتے ہیں تو اس نے قہقہہ مار کر کہا: ارے تو ہی نواب مرزا ہے۔:

ایک ہی مرشد ہو تم قصور معاف سن چکی ہوں میں آپ کے اوصاف

اودھ کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ 'بکسر کی جنگ' میں شکست کے بعد شجاع الدولہ عیش و عشرت ڈوب گیا۔ یہی روایت آصف الدولہ سے واجد علی شاہ تک نمایاں سے نمایاں تر ہوتی گئی۔ نواب مرزا شوق کا لکھنؤ

مرزا شوق لکھنوی 'حیات' مثنوی
نگاری اور متن کی تدریس (زہر
عشق، معشوق کی رخصتی)

واجد علی شاہ کا وہ لکھنؤ ہے جو عیش پرستی کا دل دادہ ہو چکا تھا۔ اندر سبھائیں ہو رہی تھیں، سوانگ رچائے جا رہے تھے خود جان عالم ان تقریبات میں پیش پیش تھے۔ پورا معاشرہ سرور مستی اور عیش و نشاط میں ڈوبا ہوا تھا۔ کیا عوام اور کیا خواص سب پر کبھی کلچر کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ مردوں کا کوٹھوں پر جانے کا رواج و با کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ معاشرے میں کبھیوں، ڈیراہ داریوں اور طوائفوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ بیگمات کہنے کو پردہ نشین تھیں لیکن ان کے عادات و اطوار پر بازاری عورتوں اور کبھیوں کا جا دو چل رہا تھا۔ طوائف کوٹھوں سے محلوں میں داخل ہو گئی تھی۔ واجد علی شاہ کی زیادہ تر معشوقاؤں کا تعلق اسی طبقے سے تھا۔

مرزا شوق نے جب شعور کی منزلیں طے کیں اس وقت ہر طرف شاعری کا چرچا تھا۔ معاشرے میں شعرا کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مرزا شوق کو اسی ماحول سے شعر گوئی کی تحریک ملی۔ انھوں نے خواجہ حیدر علی آتش کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور ان سے فن کی باریکیاں سیکھیں۔ آتش نے شوق کو صرف فن کے اسرار و رموز نہیں سکھائے بلکہ ان کی معیت میں مرزا کے مزاج کی رنگینی میں مزید نکھار آیا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں غزلیں کہیں۔ بعد میں طویل نظموں کی طرف مائل ہوئے اور مثنوی میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ مرزا شوق واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں دربار سے بطور وظیفہ پانچ سو روپے ملتے تھے۔ لکھنؤ میں ہی ان کا انتقال ہوا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ تذکرہ شوق کے مصنف عطاء اللہ پالوی نے لکھا ہے:

”شوق نے 30 جون 1871ء کو 88 سال کی عمر میں انتقال کیا۔ لکھنؤ کے ریلوے لائن کے نیچے قبرستان میں دفن ہیں جہاں میر تقی میر، سید انشاء اللہ خان انشا اور مصحفی وغیرہ دفن ہیں۔“ (1) (تذکرہ شوق، عطا پالوی، سن اشاعت 1956)

نواب مرزا شوق سے تین مثنویاں یادگار ہیں تاہم ان کی شہرت کا انحصار ان کی مثنوی 'زہر عشق' پر قائم ہے۔ ان سے کچھ اور مثنویاں بھی منسوب ہیں جیسے 'لذت عشق' اور 'خبر عشق'۔ لیکن یہ بات تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ ان کی صرف تین مثنویاں ہیں۔ شوق کی مثنویوں پر عریاں نگاری اور فحاشی کے الزامات عائد کیے جاتے ہیں لیکن غور کرنے کریں تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی جو متعلقہ عہد کی تہذیبی زندگی کا حصہ نہیں تھی۔ ہاں، انھوں نے رنگینی بیان سے کام لیتے ہوئے بعض مقامات پر بے باکانہ انداز میں معاملاتِ عشق کو پیش کیا ہے۔ ہمیں یہ ذہن نشین رکھنا ہوگا کہ مرزا شوق نے لکھنؤ کے جس معاشرے کو اپنی مثنویوں میں پیش کیا ہے اس میں طوائف کو مرکزیت حاصل تھی۔ ادب میں ریختی اور واسوخت کے چلن کے پس پردہ وہی طوائف تھی جو فکر کے مرکز میں براجمان تھی۔ درگاہ، کربلا، حسن آباد کا امام باڑہ اور نوچندی کا میلا صرف تہذیبی زندگی کی ہلچل اور رونق کے لیے مشہور نہ تھے بلکہ یہ تہذیبی ادارے غلط کاریوں کے بدنام اڈے بھی تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس عہد کو

’کسی کلچر سے تعبیر کیا ہے جس سے اس معاشرے میں طوائف کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ نواب مرزا نے وہ بیان کیا جو انھوں نے دیکھا اور محسوس کیا۔ جہاں تک ناگفتنی مناظر اور کیفیات کو مزے لے کر بیان کرنے کا تعلق ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید اپنی کتاب ’اردو ادب کی مختصر تاریخ‘ میں لکھتے ہیں:

”مرزا شوق نے اس مثنوی میں ذکر گناہ سے لذت لی اور اس میں پڑھنے والوں کو شریک کرنے کے لیے

مردانہ اور زنانہ محاوروں کو بے باکی اور عریانی سے استعمال کیا ہے۔“ 2

(اردو ادب کی مختصر تاریخ، ڈاکٹر انور سدید، ایم آر پی بلیکیشنز سن اشاعت 2019 ص 201)

مرزا شوق لکھنوی کی پہلی مثنوی ’فریب عشق‘ ہے جو 1846ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ ’مثنوی فریب عشق‘ 1428 اشعار پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے عطاء اللہ پالوی نے لکھا ہے:

”اس مثنوی کے ذریعے اہل لکھنؤ کو علی الاعلان اس سے آگاہ کیا گیا کہ اس وقت کربلا، درگاہ اور وہ سارے

مقامات مقدسہ جہاں جہاں مذہبی آڑ لے کر اجتماع مردوزن ہوتا ہے وہ شبستان عیش و آوارگی کا اڈہ بنے

ہوئے ہیں اور ہماری عورتیں وہاں ہرگز تزکیہ نفس کے لیے نہیں بلکہ تسکین نفس کے لیے جایا کرتی ہیں۔“ 3

(بحوالہ مثنویات شوق مرتب: رشید حسن خاں انجمن ترقی اردو، ہند، نئی دہلی سن اشاعت 1988)

’بہار عشق‘ مرزا شوق کی دوسری مثنوی ہے۔ یہ مثنوی 1847ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس میں 842 اشعار ہیں۔ ’فریب عشق‘ کی طرح یہ مثنوی بھی اپنے عہد کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کی تصویر پیش کرتی ہے۔ زبان و بیان کی خوبیوں سے قطع نظر اس میں وصل کی تفصیلات جس بے باکی سے اور بے محابا انداز میں بیان کی گئی ہیں وہ عریاں نگاری کے الزام کے لیے کافی ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی نے شوق کی اس مثنوی کو زبان و بیان کے اعتبار سے سب سے بہتر مثنوی قرار دیا ہے۔

’زہر عشق‘ نواب مرزا شوق کی تیسری اور آخری مثنوی ہے۔ مرزا شوق کی مثنوی ’زہر عشق‘ اردو مثنوی نگاری کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ’زہر عشق‘ کی تصنیف کس سال ہوئی اس سلسلے میں مختلف آرا ملتی ہیں۔ شاہ عبداللہ نے اس کی تصنیف کا زمانہ 1860 سے 1882 کے دوران کا بتایا ہے جب کہ نظامی بدایونی نے 1861 کو اس سن تصنیف قرار دیا ہے۔ رشید حسن خاں نے کوئی حتمی سن تصنیف نہیں بتائی تاہم مختلف شہادتوں کی بنیاد پر اندازہ لگایا ہے کہ یہ 1861 کے آس پاس کے زمانہ میں تصنیف ہوئی ہوگی۔ 4

(مثنویات شوق مرتب: رشید حسن خاں انجمن ترقی اردو، ہند، نئی دہلی سن اشاعت 1988)

’زہر عشق‘ 1455 اشعار پر مشتمل ایک حزنیہ مثنوی ہے۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا شوق نے لکھنؤ کے روز

مرزا شوق لکھنوی 'حیات' مثنوی
نگاری اور متن کی تدریس (زہر
عشق، معشوق کی رخصتی)

مرہ و با محاورہ اور وہاں کی بیگماتی زبان کو خوبی سے برت کر متعلقہ عہد کی تہذیبی زندگی کے نقوش محفوظ کر دیے
ہیں۔

'زہر عشق' کا موازنہ جرمن ادیب گوٹے کے The Sorrow of young werthe سے بھی کیا گیا ہے۔
ان دونوں تخلیقات میں مختلف واقعات کی ترتیب و تنظیم اور موضوعات کی سطح ایک دوسرے سے الگ ہونے کے
باوجود ایک قدر مشترک ہے۔ دونوں مقامات پر زندگی یکساں نظر آتی ہے اور دونوں تخلیقات میں انجام ایک جیسا
دکھائی دیتا ہے۔ مثنوی 'زہر عشق' کی ہیروئن مہ جین عشق میں رسوائی کے خوف سے خودکشی کر لیتی ہے۔ اسی طرح
گوٹے کی تخلیق میں ایک نوجوان عشق میں ناکامی کے بعد خودکشی پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مذکورہ مثنویوں میں سماجی و تہذیبی زندگی کی ایسی تفصیلات جمع ہو گئی ہیں کہ ان سے متعلقہ عہد کی تہذیبی و تمدنی تاریخ
کی ترتیب میں مدد لی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر عورتوں کی مصروفیات کیا تھیں، ان کے ملبوسات کیسے تھے، مرد و
زن کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی، امیرزادیاں اور بیگمات کس طرح اکیلی ڈولیوں میں سیر کونکل جاتی تھیں، ان
کی زبان اور ان کا محاورہ کیا تھا، ان کی زبان پر کس طرح بازاری عورتوں کے محاورے چڑھے ہوئے تھے، گانے
، بجانے، رقص، موسیقی اور شعر و سخن کی محفلیں کس طرح معاشرتی زندگی کا لازمہ بن گئی تھیں ان مثنویوں کے مطالعہ
سے ان تفصیلات تک رسائی ہوتی ہے۔ اسی طرح ان مثنویوں سے یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے اس زمانے میں باغ
کس وضع کے ہوتے تھے۔ ان باغات میں کون کون سے پھول کھلائے جاتے تھے۔ حقیقی زندگی سے مذہب کا کیا
واسطہ تھا۔ غرض یہ ساری وہ باتیں ہیں جنہیں ان مثنویوں کا تجزیہ کرتے وقت ذہن میں رکھنا سودمند ہو سکتا ہے۔

مرزا شوق نے مثنوی کے علاوہ غزلیں اور واسوخت بھی تحریر کیے ہیں۔ ان کی غزلیں روایتی انداز کی ہیں اور ان
میں عشق و عاشقی کے موضوعات بیان ہوئے ہیں۔ انہوں نے اکتالیس بندوں پر مشتمل ایک واسوخت بھی لکھا
ہے جو فدا علی عیش کے مرتب کردہ مجموعہ 'واسوخت' میں شامل ہے۔ واسوخت کے لغوی جلی کٹی سنانا ہے۔ اصطلاح
میں اس سے وہ صنف شاعری مراد ہے جس میں عاشق محبوب کی کج ادائیگیوں اور اس کے ظلم و ستم سے تنگ آکر اس
سے بے زاری کا اظہار کرتا ہے۔ محبوب کو جلانے، چڑانے اور ستانے کے لیے کسی دوسرے سے محبت کا ڈھونگ
بھی کرتا ہے۔ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ محبوب اس کی طرف ملتفت ہو، اس سے بے توجہی نہ برتے اور رقیب پر
مہربان نہ ہو۔ واسوخت کے لیے کوئی ہیئت مقرر نہیں ہے۔ نواب مرزا شوق کا واسوخت مسدس کی ہیئت میں ہے
اور اس میں روایت کی پاس داری نظر آتی ہے ان کے واسوخت کے یہ چند اشعار ملاحظہ کریں:

اب تو ہے اور ہی کچھ چہرہ زیبا کا بہار
دن میں آرائش تن ہونے لگے سو سو بار
جنبش ابرو پہ چل جاتی ہے دم میں تلوار

گرتے ہیں پھول سے رخسار پہ عشاق ہزار
ذاک کی طرح سے رخسار جو ضودیتے ہیں
عکس پڑ پڑ کے گہر کے کان میں لودیتے ہیں

نواب مرزا شوق کے علمی و ادبی کارناموں کے جائزے سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے مثنوی، غزل اور واسوخت میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن ان کی شہرت اور مقبولیت کا سارا دار و مدار ان کی مثنویوں پر قائم ہے۔ مثنویوں میں شوق کا شاعرانہ کمال انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ انھوں نے اپنی مثنویوں میں صرف لکھنؤ کے محاورہ نسواں کو محفوظ نہیں کیا بلکہ کرداروں کی سرگرمیوں سے اس عہد کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کو بھی پیش کیا ہے۔ یہاں جذبات نگاری بھی ہے اور سراپا نگاری و جزئیات نگاری کے بہترین نمونے بھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے شوق کی مثنویوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ 'شوق نے یہ مثنویاں لکھ کر ناخ کے طرز جدید کے طلسم کو توڑ دیا اور اردو شاعری کو ایک نئی سمت دی جس میں روزمرہ کی زبان کے استعمال کو دوبارہ زندہ کر کے شعر و ادب کے رخ کو بدل دیا۔' گلزار نسیم، طرز جدید کا شاہ کار ہے اور شوق کی تینوں مثنویاں اس کا ردعمل۔ ان مثنویوں میں شوق نے بول چال کی عام و خاص زبان اور لہجوں کو ملا کر ایک کر دیا ہے۔ گویا شوق کی مثنویاں اس لیے بھی اہم ہیں ان سے زبان کی شاعری ایک نئے رجحان کے طور پر آگے بڑھی اور پھولی پھلی۔ بہر حال یہ کہنے کوئی حرج نہیں کچھ خامیوں کے باوجود ان کی مثنویاں اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ محفوظ رہیں گی۔

18.4 مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی نگاری کا جائزہ

مرزا شوق کی مثنوی نگاری کی خصوصیات کیا ہیں؟ یہ جاننے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم دو باتیں جان لیں۔ ایک یہ کہ ان کی مثنویوں کے ماخذ کیا ہیں؟ آیا ان کی مثنویاں طبع زاد ہیں یا پھر انھوں نے استفادہ کیا ہے۔ اگر استفادہ کیا ہے تو اس کی کیا صورت ہے۔ دوسری بات یہ کہ شوق کی مثنوی نگاری سے متعلق ماہرین کی آرا کیا ہیں؟

بعض ناقدین نے مومن کی مثنویات اور میر اثر کی 'خواب و خیال' کو ان کی مثنویوں کا ماخذ قرار دیا ہے۔ 'خواب و خیال' میں آپ بیتی کا جو پیرایہ بیان اختیار کیا گیا ہے مثنویات شوق میں اس کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ماخذ قرار دینے کے پس پردہ ان میں داخلی مماثلت کا پیدا ہونا ایک اہم وجہ ہے۔ بعض لوگوں نے ان کی مثنویوں پر واجد علی شاہ کی 'بحر الفت' اور میر کی مثنوی 'دریائے عشق' کے اثرات کا پتہ لگایا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مرزا شوق لکھنوی نے ان مثنویوں سے استفادے کے ساتھ اپنے تخیل پر بھی بھروسہ کیا ہے۔ شوق کی مثنویوں میں اخذ و استفادے کے ساتھ اپنی راہ الگ پیدا کرنے کی جو صورت حال ہے اسے ڈاکٹر جمیل جالبی نے دلچسپ استعاراتی انداز میں بیان کرتے ہوئے 'نومولو دینچے کے وجود سے تعبیر کیا ہے:

اجزا ہیں۔ ان میں روزمرہ اور محاورہ کا پورا لطف موجود ہے۔ اگر شوق پر اپنے زمانے کے مذاق کا اثر غالب نہ ہوتا تو وہ یقیناً

ایک بڑے صنّاع ثابت ہوتے۔ بحالت موجودہ شوق کی مثنویاں واجد علی شاہ کے زمانے کے تعیش پسند لکھنؤ کے
دوفا شعرا نقشبے معلوم ہوتے ہیں۔ 7

(اردو مثنوی کا ارتقا، عبدالقادر سروری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1996 ص 129)

نواب مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے جس چیز پر سب سے پہلے نگاہ ٹھہرتی ہے وہ ان کی
مثنویوں کی زبان ہے۔ انہوں نے میں اپنی مثنویوں میں جو زبان استعمال کی ہے اس میں لکھنؤ کا روزمرہ اور
بیگمات لکھنؤ کے محاورات شامل ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ شوق کی مثنویوں کی تخلیق کے پس پردہ محاورات نسواں کا
تحفظ ایک اہم جذبے کے طور پر کارفرما ہے۔ شوق نے خود اپنی مثنوی 'بہار عشق' کے اختتام پر اس کے متعلق بتایا
ہے۔ مثنوی نگاری کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کی انوکھی پہل تھی جس میں زبان کو تخلیق کے مرکز میں رکھ کر پیش کیا
گیا تھا۔ شوق کی مثنویوں میں روزمرہ اور محاورے کی بھرپور چاشنی موجود ہے۔ یہ چند اشعار ان کی مثنوی 'بہار عشق'
کے الگ الگ موقعوں سے لیے گئے ہیں، ان میں روزمرہ اور محاورہ اس خوبی سے ادا ہوئے ہیں کہ بے ساختہ داد
دینے کو دل چاہتا ہے۔

شہر سارا اجاڑ تھا گویا اتنا رستہ پہاڑ تھا گویا
نہ سنی اور کی نہ اپنی کہی دل کی حسرت تمام دل میں رہی
اللہ آ میں سے اس کو پالا ہے سارے گھر کا یہی اجالا ہے
آنکھ ایک ایک پر لگا وٹ کی بات ایک ایک گھلا وٹ کی
یہاں ٹھہری کبھی وہاں ٹھہری دو منہ ہنس بول لی جہاں ٹھہری
ایک ساغر میں ہوش اڑ گئے واہ کتنے کم ظرف ہو معاذ اللہ
اپنے سائے سے بھی بھڑکتی ہے بوٹی بوٹی پڑی پھڑکتی ہے

شوق کی مثنوی نگاری کی ایک خوبی ان کی کردار نگاری ہے۔ ان کی مثنویوں میں گوشت پوست کے انسان چلتے
پھرتے نظر آتے ہیں اور یہ کردار اپنی سرگرمیوں سے قصوں میں جان ڈال دیتے ہیں۔ ان کی مثنویوں کے بعض
کردار ایسے ہیں جو اپنے منفرد خدو خال کے ساتھ ہمارے حافظے میں محفوظ ہو گئے ہیں جیسے کہ زہر عشق کی ہیروئن

مرزا شوق لکھنوی 'حیات' مثنوی
نگاری اور متن کی تدریس (زہر
عشق، معشوق کی رخصتی)

مہ جبین یا پھر بہار عشق کی مہ لقا۔ مہ لقا کے کردار کو پیش کرتے ہوئے شوق نے ہنرمندی اور صناعتی سے کام لیا ہے۔ مہ لقا کی جو تصویر شوق نے پیش کی ہے اس میں دلکشی کے ساتھ تکمیلیت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ طوالت کے خوف سے صرف چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

ایک دن جو برائے سیر اٹھا دیکھی کوٹھے پہ ایک ماہ لقا
بام، روشن تھا طور کی صورت سر سے پاتک تھی نور کی صورت
حسن یوسف بھی اس کے آگے ماند چہرہ زلفوں میں جیسے ابر میں چاند
گل سے رخسار، گول گول بدن گات جس طرح قمقمے روشن
رخ پہ وہ بکھرے بکھرے زلف کے بال رگ گل سے وہ ہونٹ پان سے لال
بے مسی کے وہ دانت رشکِ قمر جان عاشق نثار ہو جس پر
ناک میں نیم کا فقط تنکا شوخی چالا کی مقتضاسن کا
آستینوں کی وہ پھنسی کرتی جسم میں وہ شباب کی پھرتی

شوق کی مثنویوں میں 'زہر عشق' کی ہیروئن کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کی ہیروئن خود کشی کے عمل سے خود کو گزار کر عشق میں ثابت قدمی کی ایک اعلیٰ مثال پیش کرتی ہے۔ ہم خود کو مہ جبین کے غم میں برابر کے شریک پاتے ہیں۔

مرزا شوق کی مثنویاں پڑھتے ہوئے ہمیں واقعیت (Realism) اور حسیت (Sensuousness) کا بھی احساس ہوتا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی نے شوق کی مثنویوں میں واقعیت اور حسیت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'مثنوی میں (زہر عشق میں) ایک جگہ بھی ایسی نہیں ملتی جہاں شوق اثر انگیزی میں ناکام رہے ہوں وہ کوئی ایسی چیز بیان نہیں کرتے جو قدرت کے مسلمات کے خلاف ہو یا فطرت کے اصولوں سے متصادم نظر آتی ہو۔ ابھی مہ جبین کے کردار کا ذکر ہوا، شوق نے رخصتی کے وقت جن جذبات و کیفیات کو پیش کیا ہے ان کے فطری ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہیروئن کی خود کشی کے بعد شوق نے جس سوگوار ماحول کا نقشہ کھینچا ہے اور عاشق کے دل کی مختلف کیفیات کو جس انداز میں رقم کیا ہے وہ واقعیت اور حسیت کا بہترین نمونہ ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ شوق کی مثنویوں میں فوق فطری عناصر نہیں ہے بلکہ گوشت پوست کے ہمارے اور آپ جیسے انسان ہیں اور ان کی خوبیاں اور خامیاں بیان کی گئی ہیں اس وجہ سے ان میں واقعیت اور حسیت کا واضح رنگ جھلکتا ہے۔

شوق کی مثنوی نگاری کی ایک اہم خوبی ان کی جذبات نگاری ہے۔ انھوں نے اپنی مثنویوں میں اور خاص طور پر 'زہر عشق' میں جذبات نگاری کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ عشق کے مختلف تجربات اور اس کی متنوع کیفیات کو

انہوں نے کامیابی سے برتا ہے۔ عاشق، ماہ رو کو دیکھ کر بے تاب ہو جاتا ہے، ملنے کے لیے بے قرار ہے لیکن دیدار کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔ اس صورت حال میں عاشق جن تجربات و کیفیات سے گزرتا ہے انہیں مرزا سوز کے ساتھ بیان کیا ہے:

ہوئی میری جو اس کی چارنگاہ	منہ سے بے ساختہ نکل گئی آہ
حال دل کا کہا نہیں جاتا	خوب سنبھلا، نہیں غش آجاتا
نہ ہوا گو کلام فی مابین	روح قالب میں ہو گئی بے چین
تیر الفت جو تھا لگا کاری	اشک بے ساختہ ہو گئے جاری
سامنے وہ کھڑی تھی ماہ منیر	چپ کھڑا تھا میں صورت تصویر
تاب نظارہ اتنی لانا نہ سکا	کہ اشارے سے بھی بلا نہ سکا

مرزا کی مثنویاں اپنے عہد کی زبان اور اس دور کی تہذیبی و سماجی زندگی کا مظہر ہیں۔ ان کی مثنوی 'فریب عشق' کی ہیروئن امیر زادی ہے لیکن اس کی زبان میں اور ایک کسی کی زبان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

کیا موؤں پر قیامت آئی ہے	موٹی کاٹوں کی شامت آئی ہے
یہاں لا کر جو مجھ کو ڈالا ہے	دال میں کچھ نہ کچھ کالا ہے

خود ہیرو کو یقین نہیں کہ یہ عورت باعصمت ہے۔

آئے نوچندی میں نہ یہ زہار	گر حقیقت میں ہوئے عصمت دار
رنڈیاں گو کہ ساری آفت ہیں	بیگمیں اور بھی قیامت ہیں
زہران میں بھرا ہے سر تا سر	نہیں کاٹے کا ان میں ہے منتر
کھلتا ہراک پہ اُن کا حال نہیں	کون اس میں ہے جو چھناں نہیں

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ مرزا شوق کی تینوں مثنویوں میں عشق کے الگ الگ پہلو سے سابقہ پڑتا ہے۔ 'فریب عشق' میں ہوس اور تماشا بینی ہے۔ مرد ہر جانی ہے اور اپنے مطلب کی برآری کے لیے جھوٹ کا سہارا لینے میں اسے کوئی عار نہیں ہے۔ مثنوی 'بہار عشق' ہمارے سامنے عشق کا ایک نیا زاویہ لاتی ہے جس میں عاشق اپنی محنت رائیگاں جاتا دیکھ کر شادی کے ذریعے وصل کی راہ ہموار کرتا ہے۔ عشق کی ایک تیسری جہت ہے جو مثنوی 'زہر عشق' میں ملتی ہے۔ 'زہر عشق' کے ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے پر عاشق دل و جان سے عاشق ہیں۔ بعد میں ہیروئن رسوائی کے خوف سے خودکشی کر لیتی ہے اور عاشق بھی خودکشی کرتا ہے لیکن بچ جاتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے 'زہر عشق' کی جہت کو اس دور کی سچی کہانی بتایا ہے۔ 'زہر عشق' ایک حزن نیا اور مثنوی ہے جو یاس، حسرت اور غم پر

اختتام پذیر ہوتی۔

مرزا شوق لکھنوی 'حیات' مثنوی
نگاری اور متن کی تدریس (زہر
عشق، معشوق کی رخصتی)

مرزا شوق کی مثنوی نگاری کا یہ بیان ان کی مثنویوں میں موجود نقائص کے بیان کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ ان کی مثنویوں میں خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

”شوق کے قصوں میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ ان میں تنوع نہیں ہے۔ انجام سے قطع نظر، جزئیات میں تمام مثنویاں ایک جیسی معلوم ہوتی ہیں۔ اور یہی حال کرداروں کا بھی ہے۔ صرف ’زہر عشق‘ کی ہیروئن میں کسی قدر انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔ تناسب جو حسن کاری کی جان ہے، ان مثنویوں میں مفقود ہے۔ ہیروئن کی گفتگو کو بے ضرورت طولانی بنا دیا گیا ہے۔“ 8

(اردو مثنوی کا ارتقا، عبدالقادر سروری، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1996 ص 130)

ان نقائص کے باوجود یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ شوق کی مثنویاں خاص طور پر ’زہر عشق‘ اردو ادب میں زندہ رہے گی۔

18.5 متن کی تدریس (زہر عشق، معشوق کی رخصتی)

مثنوی ’زہر عشق‘ میں ’معشوق کی رخصتی‘ والا حصہ سادہ لیکن پُرکار بیانہ کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ حصہ عشق کی مختلف کیفیات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہم اس کے بیان میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ مرزا شوق نے معشوق کی رخصتی کا حال انتہائی کرب ناک انداز میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے معشوق کی دلی کیفیت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

تھا یہی ذکر جو بجا گھڑیاں
سنتے ہی اس کے ہو گئی بے حال
ہو گیا فرطِ غم سے چہرہ زرد
دست و پا تھر تھرا کے ہو گئے سرد
مردنی رخ پہ چھا گئی اس کے
دل میں دہشت سما گئی اس کے

مرزا شوق نے واقعہ کی منظر کشی کچھ اس انداز میں کی ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شاعر کے مطابق گھڑیاں کے بجتے ہی معشوق کی حالت غیر ہونے لگی۔ غم کی شدت سے نہ صرف یہ کہ اس کا چہرہ زرد ہو گیا بلکہ اس کے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا اور دل میں یہ خوف جاگزیں ہوا کہ اب

رخصت کا وقت قریب ہے۔ اتنے میں صبح کی سفیدی نمودار ہوگئی جس سے اس کا اضطراب بھی بڑھتا گیا۔ وہ اپنا ہوش و حواس کھونے لگی۔ خود کو اس عاشقی پر کوسنے لگی اور لعنت ملامت کرنے لگی۔ وہ اپنی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے معافی کی طلب گار ہوئی کہ اس کا کہا سنا معاف کیا جائے۔ وہ اخیر وقت میں زار و قطار روتے ہوئے بولی کہ تم غم نہ کرنا، میں تمہیں چھیڑنے کے لیے پریشان کرتی تھی، اور یہ کہہ کر وہ روتے ہوئے رخصت ہونے لگی۔

ادھر عاشق کا حال بھی ناگفتہ بہ تھا۔ اسے وہ ساری باتیں یاد آتی ہیں جو اس نے آخری ملاقات میں کہی تھیں اور وہ بے قرار و بے چین ہو جاتا ہے۔

دل میں، کہنے کا اس کے، تھا جو ملال آتے تھے ذہن میں عجیب خیال
کون رو کے گا جا کے گھر بیٹھے جو کہا ہے، وہی نہ کر بیٹھے
ہر گھڑی تھا جو اضطراب فزوں چپکا روتا تھا بیٹھا میں محزوں

تبھی اطراف سے ایک شور اٹھا اور دل بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ صبر نہ آیا تو دوست کو ماجرا جاننے کے لیے روانہ کیا۔ واپس آ کر اس نے بتایا کہ باغ کے پاس جو سوداگر کا گھر ہے وہیں سے نالہ و شیون کی آوازیں آرہی ہیں۔ لیکن یہ راز نہیں کھلتا آخر بات کیا ہے تاہم منظر دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا کوئی جوان عزیز دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ محل کے سارے لوگ ماتم اور آہ و نغاں کر رہے ہیں۔ تب عاشق یہ سوچتا ہے کہ محبوب نے ملاقات کے دن زہر کھا کر زندگی ختم کرنے کی بات کہی تھی کہیں ایسا تو نہیں اسی نے زہر کھا لیا ہو۔ عاشق کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے سر ابھارتے ہیں۔ عاشق کی خستہ حالت کو دیکھ کر اس کے احباب اس کا سبب پوچھتے ہیں لیکن وہ انہیں کچھ بھی نہیں بتاتا۔ سوداگر کے گھر کی طرف سے جو لوگ ادھر آتے ہیں وہ معشوق کے والدین کا المناک حال بیان کرتے ہیں۔

نوچ ڈالے ہیں سارے سر کے بال کیا پریشاں ہے والدین کا حال
آفت تازہ سر پہ ہے آئی بگ رہے ہیں مثال سودائی
جو کہ تھے اس میں صاحب اولاد حال ابتر تھا ان کا حد سے زیاد
کہتے تھے کوٹ کر سرو سینا کیوں نہ دشوار ان کو ہو جینا
مرگ اولاد کا وہ ماتم ہے رنج و غم جس قدر کریں، کم ہے

غرض زہر عشق، میں معشوق کی رخصتی والا حصہ سچے عاشق و معشوق کے درد کو کامیابی سے اجاگر کرتا ہے۔ بیانیہ انداز میں شاعر نے مختلف افراد کے جذبات اور ان کی دلی کیفیات کو الگ الگ انداز میں بیان کیا ہے۔ مرزا شوق نے اس حصے میں جذبات نگاری کا ایسا حسین مرقع پیش کیا ہے کہ سارا منظر نگاہوں میں رقص کرنے لگتا ہے

مرزا شوق لکھنوی حیات، مثنوی
نگاری اور متن کی تدریس (زہر
عشق، معشوق کی رخصتی)

آتش غم سے دل ہوا ہے کباب
ہے تپاں مثلِ ماہی بے آب
چشمہ جاری ہے چشمِ گریاں کا
ہوش باقی نہیں تن و جاں کا
نہیں دم بھر کسی کو واں آرام
دیکھنے والے رو رہے ہیں تمام

ابھی آپ نے چند اشعار پڑھے ان سے آپ کو مرزا شوق کے یہاں زبان و بیان اور جذبات نگاری ہر دو سطح پر دلکشی کا احساس ہوا ہوگا۔ مرزا شوق کی شاعری کا یہ پیرایہ بیان صرف 'زہر عشق' تک محدود نہیں بلکہ ان کی دیگر مثنویوں میں بھی جاری و ساری ہے۔

18.6 ماحصل

نواب مرزا شوق کی مثنویاں لکھنؤ کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ انھوں نے اپنی مثنویوں میں محققہ عہد کے تہذیبی اداروں کے ارد گرد گردش کرتی انسانی زندگی کو آپ بیتی کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے مثنوی کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی لیکن اردو میں ان کی شہرت مثنویوں کی وجہ سے قائم ہے۔ ان کی مثنوی نگاری سادگی و سلاست اور روانی سے عبارت ہے۔ ان کا بیانیہ سادہ لیکن پُرکشش ہے۔ ان کی مثنویوں میں چلتے پھرتے انسانوں کی کہانی بیان ہوئی ہے جس کی وجہ سے ہمیں ان میں ایک گونہ کشش محسوس ہوتی ہے۔ انسانی جذبات کی تصویر کشی میں مرزا شوق کو ید طولی حاصل تھا۔ مثنوی 'زہر عشق' میں معشوق کی رخصتی والا بیان جذبات نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ فنی نقطہ نظر سے مرزا شوق کا قابل فخر کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی مثنویوں میں لکھنؤ کے روزمرہ اور اس کے محاوروں اور بیگماتی زبان کو محفوظ کر دیا ہے۔ انھوں نے کرداروں کے مکالموں کو ان کے مقام و مرتبے کے اعتبار سے پیش کیا ہے خاص طور پر مثنوی 'زہر عشق' کی ہیروئن مہ جبین ایک فعال کردار ہے جس سے ان کی کردار نگاری پر دسترس کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ غرض یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں اردو مثنوی نگاری کی کوئی تاریخ نواب مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی نگاری کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کہی جاسکتی۔

18.7 آپ نے کیا سیکھا؟

اس اکائی میں

1. آپ نے مرزا شوق کی حیات اور ان کے مختلف کارناموں کے متعلق جانا
2. آپ نے مرزا شوق کی مثنوی نگاری کا تفصیلی مطالعہ کیا

3. آپ نے مرزا شوق لکھنوی کی مشہور مثنوی 'زہر عشق' کے ایک حصے کا خصوصی مطالعہ بھی کیا

18.8 اپنا امتحان خود لیجیے

1. مرزا شوق لکھنوی کا اصل نام کیا ہے؟
2. مرزا شوق کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
3. شوق کا خاندانی پیشہ کیا تھا؟
4. مرزا شوق لکھنوی نے شاعری میں کس سے اصلاح لی؟
5. مرزا شوق کی مثنوی نگاری کی خصوصیات کیا ہیں؟
6. مرزا شوق نے مثنویوں کے علاوہ اور کیا کیا لکھا ہے؟
7. مرزا شوق کی کس مثنوی میں معشوق کی رخصتی کا بیان ہے؟
8. مرزا شوق کی مثنویوں کی صحیح ترتیب کیا ہے؟
9. اردو کی تین اہم مثنویوں میں زہر عشق کے علاوہ اور کون سی دو مثنویاں شامل ہیں؟
10. مرزا شوق لکھنوی نے 'زہر عشق' میں کہاں کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کو پیش کیا ہے؟

18.9 سوالات کے جوابات

1. تصدق حسین خان
2. نواب مرزا شوق لکھنوی 6 جنوری 1783 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے
3. مرزا شوق لکھنوی کا خاندانی پیشہ حکمت و طبابت تھا
4. خواجہ حیدر علی آتش سے
5. لکھنوی بیگماتی زبان کا استعمال، جذبات نگاری، سادگی و سلاست اور روانی ان کی مثنویوں کی عام خصوصیات ہیں
6. غزلیں اور ایک واسوخت بھی لکھا ہے
7. مثنوی 'زہر عشق' میں معشوق کی رخصتی کا بیان ہے
8. فریب عشق، بہار عشق اور زہر عشق

9. مثنوی سحرالبیان اور مثنوی گلزار نسیم
10. لکھنوی تہذیبی و معاشرتی زندگی کو پیش کیا ہے

مرزا شوق لکھنوی حیات، مثنوی
نگاری اور متن کی تدریس (زہر
عشق، معشوق کی رخصتی)

18.10 فرہنگ

اندوہ ناک	حزنیہ
زمانہ، وقت	عہد
طب کا پیشہ، کام یا فن	طبابت
شاگردی اختیار کرنا	زانوئے تلمذ تہہ کرنا
راز، سر کی جمع	اسرار
رازی کی جمع، پوشیدہ بات	رموز
زمانہ	عہد
ہم راہی	معیت
پنشن۔ تنخواہ	وظیفہ
دن اور رات	شب و روز
جس معاشرے میں کسی یعنی طوائف کو زیادہ اہمیت حاصل ہو	کسبی کلچر
متوجہ	مانقت
ایسی بات جو کہنے کے لائق نہ ہو، ناقابل بیان	ناگفتنی
پکا، مستقل	حتمی
گواہی، واحد شہادت	شہادتوں
ہمیشہ	دوام
انصاف پسندی	عدل پسندی
قلم	خامہ
بنیادی	کلیدی
منہ	دہن
بہت بڑا کاری گر۔ ہنرمند	صناع

اردو کے نمائندہ مثنوی نگار اور مثنیٰ
کی تدریس و تفہیم

نقص کی جمع معنی خرابی۔ کمی	نقص
چہرے سے رنگ اڑ جانا۔ چہرہ پیلا پڑ جانا	چہرہ فق ہونا
جس کا نہ کہنا بہتر ہو۔ شرم ناک	ناگفتہ بہ
رنجی۔ بے قرار، مجازاً عاشق	بے بس
جوں کا توں بیان کرنا	من و عن پیش کرنا
لغوی معنی بڑا مہا ہاتھ۔ بہترین مہارت۔ اچھی دسترس	ید طولیٰ
حرکت کرنے والا۔ جاری۔ رواں	متحرک
سرگرم۔ متحرک	فعال
جھجک	تامل

18.11 کتب برائے مطالعہ

مرتب: رشید حسن خاں	مثنویات شوق
انجمن ترقی اردو، ہند، نئی دہلی سن	اشاعت 1988
ڈاکٹر جمیل جالبی	تاریخ ادب اردو (جلد سوم)
ایجوکیشنل پبلسنگ ہاؤس، دہلی	2017
سن اشاعت 1956	تذکرہ شوق
ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ایڈیشن 2002	مقدمہ شعر و شاعری
عطا اللہ پالوی	مجلدہ ارمغان
لطاف حسین حالی	(4-5) سالانہ ریسرچ اور ریفریڈ جرنل
شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی	2015--2016
عبدالقادر سروری	اردو مثنوی کا ارتقا
ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ایڈیشن	1996 بحریں اور زحافات
شمس الرحمان فاروقی	مشمولہ درس بلاغت
ترقی اردو بیورو	دہلی، چھٹی طباعت 2019